مصنفہ

حمید عظیم آبادی

بزم شاد۔ پٹنہ

کاخ

از

حمید عظیم آبادی

بہ سلسلۂ مطبوعات انجمن نوبہارِ ادب، پٹنہ سیٹی

راسخ

مؤلفہ

حضرت حمید عظیم آبادی

بہ اہتمام

سید احسان الحق نظر فریادی (معتمد انجمن)

بار اول ۵۰۰

قیمت عہ

۲
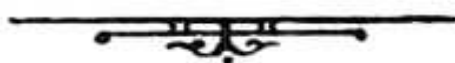
حرفِ آغاز

اُردو تنقید نے گذشتہ دس سالوں کے اندر یک گونہ ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اُردو تنقید اُس معیار تک نہیں پہونچ سکی ہے جہاں ادب عالم میں تنقید کی رسائی ہو چکی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہنوز اردو ادب خود ہی اپنے اندر وہ وسعت، گہرائی یا بلندی پیدا نہ کر سکا جو محفلِ ادب میں صدر نشیں ادبوں کو حاصل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اُردو کے دانش ور اور سخن شناس طبقے کی صحیح تنقیدی تربیت نہیں ہوئی۔ زمانے نے انیسویں صدی میں ہی اچانک طور پر ایک تہذیبی موڑ توڑ کیا تھا لیکن ہمارے ملک کے سالکینِ ادب و تمدن ابھی تک اِس حشر خیز رفتارِ زمانہ کو سمجھ نہ سکے۔ اُن کی قدریں پرانی، اُن کا اندازِ نظر پرانا، اُن کا افقِ تصور محدود، وہ بیسویں صدی میں بیٹھ کر بھی اٹھارہویں یا اوائل انیسویں صدی کی طرح سوچتے ہیں۔ میرے خیال میں صرف تنقید کے باب ہی میں نہیں بلکہ

تاریخِ ادب اُردو کے سلسلے میں بھی ابھی تک ہمارے تصورات، ہمارے انکشافات اور ہمارا نقطۂ نظر غلط آگاہ، غلط بیں اور غلط کوش ہے۔ تاریخ ادب اُردو کی جتنی کتابیں ہمارے سامنے ہیں وہ سب کی سب کم و بیش اُس رنگ میں اُردو ادب کی تاریخ پیش کرتی ہیں گویا اُردو ہندوستان کے صرف کسی علاقے میں پرورش پاتی رہی ہے۔ ابھی زبان کے مسئلے کو چھوڑیے ادب ہی کو لیجئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ عہدِ اولیٰ عہدِ متوسط، عہدِ آخر اور عہدِ جدید کے مختلف زمانوں میں اُردو ادب کے مختلف دبستان، مختلف مکتبِ خیال اور مختلف تحریکات سارے ہندوستان میں جہاں جہاں رہی ہیں اُن کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا اور فنکاروں کی انفرادی خصوصیات کے تعین کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی خصوصیات کو بھی پیش کیا جاتا۔ ان کے دل و دماغ، ان کے ذہن و روح کا تجزیہ کیا جاتا۔ اور ساتھ ساتھ ماحول کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی کیفیات کا بھی جائزہ لیا جاتا۔ لیکن ہوا یہی کہ متقدمین میں دبستان دکن کے فنکاروں کا تذکرہ کر دیا گیا اور بس۔ متوسطین میں دلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کو پیش کیا گیا اور خموشی اختیار کر لی گئی۔ متاخرین کے سلسلے میں بھی ایسی ہی کوتاہ نظری برتی گئی۔ اور عہدِ جدید کی تو ابھی تک کوئی باقاعدہ تاریخ ادب لکھی ہی نہیں گئی۔

حالانکہ اُردو ادب کی یہ ایک خاص خصوصیت ہے کہ وہ ابتدائی مرحلے سے ہی "ہندگیر" رہا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف علاقوں یا شہروں کو ادبی تحریکِ اُردو کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مثلاً ایک زمانہ تھا کہ دکن کی قطب شاہی اور عادل شاہی راجدھانیاں اُردو ادب کے لئے مرکز تھیں۔ لیکن اس دور میں بھی بہار میں خصوصیت کے ساتھ اُردو ادب کی تخلیق ہو رہی تھی۔ صوبۂ متحدہ اور پنجاب میں بھی اُردو ادب کے نمونے اس عہد میں ملتے ہیں۔ گو اب تک کی تحقیقات کے لحاظ سے خال ہی خال۔ اسی طرح کسی زمانہ میں دہلی کو اُردو ادب کی مرکزیت حاصل رہی اور دلّی ہی کا مذاقِ سخن اور رنگِ سخن کم و بیش سارے ملک پر چھا گیا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں عظیم آباد۔ لکھنؤ اور پنجاب میں بھی اُردو ادب کے فنی نمونے کثرت کے ساتھ پیش کئے جا رہے تھے۔ اور ان مختلف مراکزِ ادب کے ذریعہ اردو ادب ملک کے شہروں شہروں اور قصبوں قصبوں میں پھیل گیا۔ دلّی کو صرف قیادت اور سرداری حاصل تھی۔ مگر تاریخ نویس دلّی کے شعرا کے متعلق تو تفصیل سے لکھتے ہیں لیکن ملک کے دوسرے خطّوں کے فنکاروں کے بارے میں قلم فرسائی نہیں کرتے۔ اسی طرح دلّی کے بعد لکھنؤ کو

مرکزیت اور قیادت کے علمؔ بلند کرنے کا فخر حاصل ہوا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لکھنؤ سالارِ بے فوج تھا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اس عہد میں سارے ملک پر کم و بیش دبستانِ لکھنؤ کا اثر چھایا ہوا تھا۔ خود دلی کے فنکار لکھنویت کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ عظیم آباد اور بہار کے شعرا بھی اس عہد میں لکھنوی مذاقِ سخن سے متاثر ہوگئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر دور میں اُردو ادب کی شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن ہمارے تاریخ نویس اس بار آور درخت کی محض ایک دو شاخوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ کہنے والا حق بجانب ہوگا کہ اُردو تنقید کو کیا کہیے۔ اُردو تاریخ ادب بھی ہنوز نامکمل ہے اور غیر معیاری بھی۔

ایسی حالت میں جس کا تذکرہ اوپر ہوا اگر کوئی شخص اُردو تاریخ ادب اور اُردو تنقید کے لیے گوشوں اور زاویوں کو روشن کرے جو اب تک تاریکی میں تھے یا مدھم روشنی میں، تو بہر حال وہ قابلِ قدر ہوگا۔

جناب حمیدؔ عظیم آبادی نے راسخؔ عظیم آبادی کے کلام کا ایک انتخاب پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ایک کارآمد اور مفید دیباچہ بھی منسلک کر دیا ہے۔ حمیدؔ صاحب شادؔ عظیم آبادی کے شاگرد رشید ہیں اور آج عظیم آباد کے مسلم الثبوت

استاد۔ حمید صاحب نے "میخانۂ الہام" کے نام سے شاد عظیم آبادی کا انتخاب بھی شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ حمید صاحب مختلف ادبی کاموں اور تصانیف وتالیف میں مشغول رہنے والے بزرگ ہیں۔ اگلے وقتوں کے یہ لوگ پرانی شراب کی طرح قیمتی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے خاص فن میں جو ریاض کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی نوجوان فنکاروں کو میسر نہیں۔ زبان و ادب کی جو خدمتیں ان بزرگوں نے کیں اور کر رہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اسی سعیٔ مذکور کو لیجئے یعنی راسخ عظیم آبادی کے کلام کا انتخاب اور اس کے فن کا تعارف کرانا۔ کتنا اہم کام ہے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں۔ بہار کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اردو ادب کی تخلیق و ترویج کے ہر دور میں یہاں کثرت کے ساتھ ادبی اور فنی کام ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے صوبوں اور علاقوں میں کبھی تو چراغ اردو خوب تاب وتواں سے جلا اور کبھی جھلملاتا رہا ہے۔ لیکن عظیم آباد اور بہار میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری۔ حضرت سجاد اور حضرت عماد پھلواروی رحمہم اللہ علیہم اور بیدل عظیم آبادی کے وقت سے لے کر علامہ عظیم عظیم آبادی مرحوم تک ہر دور میں شمع اردو تاباں رہی ہے اور یکساں طور پر ہر عہد میں یہاں کی محفلوں کو منور کرتی رہی ہے۔

راسخ عظیم آبادی اسی عہد کے شاعر ہیں جب میر و مرزا اور درد و سوز دلی میں دادِ سخن دے رہے تھے۔ اس عہد میں بھی راسخ عظیم آبادی چمن میں تنہا بلبل نواسنج نہ تھا۔ راسخ کے علاوہ عشق اور جوشش عظیم آبادی کی بھی وہی اہمیت ہے جو میر، درد اور سوز دہلوی کی۔ یہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ عہدِ متوسط کے حصہ اولیٰ میں دبستانِ دلی کا رنگ سارے ہندستان کی ادبی محفلوں پر چڑھا ہوا تھا راسخ عظیم آبادی اور اس کے عصر کے دوسرے عظیم آبادی شعرا کے کلام پر بھی دہلویت کا گہرا اثر ہے۔ اس کی دو نمایاں وجہیں ہیں۔

اوّل تو یہ کہ دلی کو معیار اور مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ لہذا عظیم آبادی شعرا بھی اپنے کلام کو معیاری بنانے کے لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر دہلی کے طرز سے متاثر تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ راسخ عظیم آبادی کے دل و دماغ پر بھی میر کی استادی کا گہرا اثر تھا۔ وہ میر کے شاگرد بننے کے لئے تبرکاً ہی سہی دہلی اور لکھنؤ کا سفر کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ زندگی کا وہی ماحول کم و بیش سارے ملک پر چھایا ہوا تھا جو ماحول دلی کا تھا۔ جن سماجی، سیاسی، اقتصادی، ذہنی، نفسی اور اخلاقی علتوں نے دبستانِ

دلی کا مزاجِ شاعری پیدا کیا وہی علتیں عظیم آباد میں بھی موجود تھیں لہذا یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ میر دہلوی اور راسخ عظیم آبادی کے رنگِ سخن میں مشابہتیں پائی جائیں۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس عہد کے دوسرے عظیم آبادی شعرا بھی دہلوی شعرا سے متاثر تھے۔ ان کے تجربات و خیالات، ان کے احساسات و واردات، ان کے جذبات و تصورات کم و بیش دہلوی شعرا جیسے تھے۔

لیکن ایک بہت ہی اہم نکتہ قابلِ غور یہ ہے کہ کیا راسخ عظیم آبادی کی شاعری محض میر کی شاعری کی آوازِ بازگشت ہے یا راسخ خود اتنا بالیدہ اور مخلص فنکار ہے کہ اس کی شاعری صرف میر کی شاعری کا تتبع ہو ہی نہیں سکتی؟ ظاہر ہے شاعری کا تعلق بنیادی طور پر وجدان اور عرفان سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماحول فنکاروں کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن ہر بڑا فنکار اگر ایک طرف ماحول کا پروردہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ماحول کا پروردگار بھی۔ اگر ماحول اسے پیدا کرتا ہے تو وہ خود ایک نئے ماحول کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ شاعر مخلوقِ زمانہ بھی ہے اور خالقِ زمانہ بھی۔ اہمیت رکھنے والے فنکار اپنے فن میں اتنی انفرادیت ضرور رکھتے ہیں کہ وہ دوسرے فنکاروں سے ممتاز نظر آئیں اور ممیّز کئے جا سکیں۔ اس میں کیا شبہ کہ راسخ عظیم آبادی ایک منفرد شاعر تھا اور ایک اہلِ طرز

فنکار۔ راسخ کی شاعری کی انفرادیت نمایاں اور واضح ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم ایک جانب میر اور راسخ کی شاعری میں مشابہتیں پاتے ہیں تو دوسری جانب ہمیں ان دو جلیل القدر شاعروں کے فن میں مغائرتیں بھی ملتی ہیں۔

میرے خیال میں میر اور راسخ کی شاعری تجربہ اور ہیت دونوں اعتباروں سے آپس میں اختلاف رکھتی ہیں۔ میر کی شاعری کی ترکیب کے اندر جذبات کا عنصر نسبتاً نمایاں تر ہے اور راسخ کے یہاں تخیل کا عنصر نسبتاً واضح تر میر نازک اور لطیف تجربات کو پیش کرنے کی صلاحیت میں ممتاز ہیں اور راسخ رنگین اور رفیع تجربات کی ترجمانی میں ماہر۔ میر کے یہاں جو ربودگی اور گداز پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میر کی محبت سپردگی اور فنا کی حد تک پہنچی ہے۔ لیکن راسخ کا انفرادی رنگ یہ ہے کہ وہ گدازِ محبت کے عالم میں بھی اتنی لہک ضرور رکھتے ہیں کہ محبت اور زندگی ہی نہیں بلکہ محبوب پر بھی طنز کر سکیں۔ راسخ کے یہاں جوش پایا جاتا ہے۔ ایک لطیف جوش !! راسخ نما(ق) عالم پر لطیف اور نفیس طنز کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی مقابلے کی روح بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ چھری تلے گلا ہونے کے باوجود بھی وہ یہ دم خم رکھتے ہیں کہ آسمان کی کمان کو جھکا دیں، کڑکا دیں۔ لیکن میر تو

صرف اتنا کہتے ہیں کہ ؎

"ناحق ہم مجبوروں" پر یہ تہمت ہے مختاری کی"

میر کا دل جب جلتا بھی ہے تو وہ دوسروں پر نہیں اپنے پر طنز کر لیتے ہیں۔ اپنا مذاق اڑاتے ہیں اور دوسروں کے لئے سامانِ عبرت مہیا کرتے ہیں۔ میر کی شاعری میں مزاح و درد کے عناصر گھلے ملے ہوئے ہیں۔ راسخ کے یہاں لطیف طنز ہے لیکن بیتاب ! اس پہلو سے راسخ کچھ کچھ سودا کے مزاج سے مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن سودا کے مزاج اور فن میں داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت بھی پائی جاتی ہے۔ راسخ اور میر کے مزاج اور فن میں بڑی گہری داخلیت پائی جاتی ہے۔

اسلوب بیان اور طرزِ بیان میں بھی میر اور راسخ اپنا علیحدہ علیحدہ قماشِ فن پیش کرتے ہیں۔ میر کے یہاں سادگی، بھولاپن اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ میر کی طرزِ نگارش اردو اسالیب بیان میں اس دبستان کی طرف جھکی ہوئی ہے جس میں ہندوستانیت زیادہ ہے۔ میر بھاشا کے نرم رسیلے اور لچکدار لفظ بھی برمحل استعمال کرتے ہیں اور یہ ادا ان کے کلام میں وہ سوز و ساز پیدا کرتی ہے جو بھاشا کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ لیکن راسخ عظیم آبادی کی طرزِ نگارش نسبتاً فارسیت کی طرف مائل ہے۔ ان کے الفاظ، ان کی ترکیبیں،

ان کی تشبیہیں اور ان کے استعارے میر کی نسبتاً زیادہ ایرانی پن لئے ہوئے ہیں۔ راسخ کی طرز رنگین، رواں اور چمکیلی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ راسخ کے یہاں سادہ کاری کے نمونے نہیں ملتے بلکہ مجموعی طور پر راسخ کا اسلوب بیان میر سے نسبتاً زیادہ رنگین ہے۔ میر اور راسخ کی مثنویوں کا مطالعہ کیجئے، آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ ایک فنکار سادگی اور جذبات نگاری کی خوب صورت مثالیں پیش کرتا ہے اور دوسرا فنکار لطیف، رنگین اور حسین تخیل کے نمونے تخلیق کرتا ہے۔ بہرکیف ان دونوں اسالیبِ بیاں میں تاثیر موجود ہے۔ کیونکہ دونوں فنکاروں کے تجربے بنیادی طور پر اخلاص پر مبنی ہیں دونوں کے یہاں تجربۂ شاعرانہ میں صداقت اور جوش موجود ہے۔ دونوں بالیدہ و پختہ احساسِ فن رکھتے ہیں اور دونوں کو اظہار و پیش کش پر قدرت حاصل ہے۔

میرے ناچیز خیال میں راسخ عظیم آبادی کے کلیات کو پھر سے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ انتخاب کا وقت ابھی نہیں آیا۔ تاہم اگر راسخ کے فردوسِ تخیل کو ہم چمن در چمن نہیں دیکھ سکتے تو کم از کم اس کا ایک حسین گلدستہ ہی سہی۔ شاید اس گلدستہ کی حسن و خوبی

اس کا رنگ و بو، اہلِ ذوق کی طبیعتوں میں گدگدی پیدا کرے ان کے شوقِ طلب کو اکسائے اور ان کے احساسِ عمل کو مہمیز کرے تاکہ وہ راسخ کی شاعری کی جنت میں داخل ہوں اور ان کا شوق و ذوق وہاں کی عرفانی فضا میں آسودگی اور اطمینان کا سانس لے سکے۔
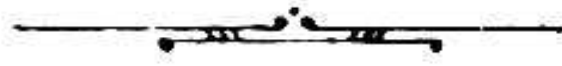
(پروفیسر) سید اختر احمد اختر اورینوی۔ ایم اے
لکچرار شعبۂ اردو۔ پٹنہ گورنمنٹ کالج۔ پٹنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ

چمن میں پھولوں کا کھلنا تو کوئی بات نہیں
زہے وہ پھول جو گلشن بنائے صحرا کو

حمید عظیم آبادی

خوشا فیضانِ باری کی چمن آرائیاں اور زہے ابرِ رحمت کی گلکاریاں کہ گلشن تو گلشن ہی ہے دشتِ خار زار اور صحرائے وحشت آثار میں بھی جلوۂ قدرت اپنا جمالِ صنعت دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ذوقِ نمائش کمال جنگل کے ان حیا پرورده پھولوں کو بھی گلشن کے کتنے پھولوں سے زیادہ دل کش اور جاذبِ نظر بنا دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ توازنِ فطرت قائم رہے! اگر یہ توازن نہ رہے اور کسی طرف کا پلّہ

جھک جائے تو کارکنانِ قضا و قدر حرف گیری کے مستحق ٹھہرائے جائیں۔ اگر گلشن کے شگفتہ پھولوں کی بہاریں دیکھنے والی ہزاروں آنکھیں ہیں تو بعض چشم بینا ایسی بھی ہیں جو صحرا کے ان پوشیدہ پھولوں میں بھی جلوۂ رنگا رنگ اور بہارِ سدا بہار کی وہ رنگینیاں دیکھتی ہیں کہ جن پر گلہائے چمن کی ساری ظاہری دل آویزیاں اور گلکاریاں نثار!! ہاں! اتنا فرق ضرور ہے کہ گلشن میں کھلنے والے پھولوں پر چمن آرایانِ گلشن کی وجہ سے عام دیکھنے والوں کی نظریں پڑتی ہیں اور وہ لطفِ نظارہ سے کیف اندوز ہوتے ہیں لیکن جنگل کے وہ چمن آرا پھول جو کسی طرح گلشن کے نظر فریب پھولوں سے کم بصیرت افروز نہیں ناقدر اہلِ زمانہ کے ہاتھوں کچھ اس طرح ویران جھاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں کہ چشمِ بصیرت بھی بہ مشکل ان تک پہونچ سکتی ہے۔ نہ اس میں قدرت کی صناعی قابلِ ایراد ہے اور نہ اُن صحرا میں کھلنے والے پھولوں کا کوئی قصور، کیونکہ قدرت کے ہاتھوں نے اپنا کام پورا کر دیا اور اُن پھولوں نے بھی کھل کر اپنی عالم گیر رنگینی سے صحرا کو جو اب گلشن بنا دیا اور اپنی دماغ پرور خوشبو سے ہزاروں کے مشامِ جاں معطر کر دئے۔ اب اگر الزام رہ جاتا ہے تو جلوۂ قدرت کی نظارہ بیں آنکھوں کو! اگر گلشن کا رہنے والا صحرا کی طرف نہیں جاتا تو نہ جائے لیکن

افسوس ہے تو اُن صحرا نشینوں پر کہ جن کی کوتاہ بین نگاہیں اُن نظرِ عام سے مخفی پھولوں پر نہیں پڑتیں اور جو اُن خوش رنگ و عطر آگیں گلوں کا دل فریب گلدستہ بنا کر گلستانِ سخن میں پیش نہیں کرتے!

۵ بیانِ شکوۂ غم پر وہ گو دیوانہ کہتے ہیں
مگر دل کھول کر ہم آج بیباکانہ کہتے ہیں

میرے ہم وطن حضرات مجھے ہزار قابلِ ملامت ٹھہرائیں اور مجھسے جو کچھ چاہیں کہیں لیکن میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بیرون پرستی میرے وطن والوں کا شعار اور اپنے ہم وطن باکمالوں کی ناقدری اِن کا شیوہ رہا ہے۔ یہ کچھ میں اپنی کہی نہیں کہتا بلکہ اُن بزرگوں کی کہی دہرا رہا ہوں جنکی گراں قدر ہستیوں کی بدولت آج عظیم آباد، عظیم آباد ہے اور اُردو دنیا میں اسے بھی ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

حضرت راسخ مرحوم فرماتے ہیں۔

عجب ہے ڈھنگ بازارِ جہاں کا — چلن ناگفتنی ہے اب تو یاں کا
متاعِ عیب کی ارزش ہے یاں تک — کہ دیں قیمت میں اُس کی نقدِ جاں تک
ہنر کا کوئی خواہاں کب رہا ہے — یہ اک معیوب جنسِ ناروا ہے
بڑھا ہے کہربا سے رتبۂ کاہ — دبے ہیں آبگینے سنگ سے آہ
ہنرمندوں کا دل خوں ہو رہا ہے — بہت افسردہ، محزوں ہو رہا ہے

نظر والے نہیں ہیں درمیاں اب   کریں عرضِ ہنر جا کر کہاں اب

حضرت شادؔ مرحوم فرماتے ہیں :-

اُس شہر میں رہ کے کی ریاضت   معدوم جہاں تھے اہلِ ہمت
میں نخلِ کمال تھا وطن میں   سرسبز ہوا نہ اس چمن میں
غم نے مرا برگ و بار چاٹا   اٹھتی ہوئی کونپلوں کو کاٹا
خیر اب یہ شکایتیں کہاں تک   پُر درد حکایتیں کہاں تک
دنیا کا بس اب نہ دم بھر و شادؔ   پیری ہے خدا کرو شاد

گلشن سخن کے اِن ہی باغبانوں کا ریاض تھا کہ مضامین و خیالات کے رنگا رنگ اور خوش نما پودے بار آور دکھائی دیئے اور اِن ہی مرقع کشوں کی نقش پردازی تھی جس نے گلہائے سخن کے وہ باغ لگائے کہ جن کی بہاریں دیکھ کر لہلہاتے چمن بھی شرمائے، لیکن افسوس ؎

بجھائے اپنے ہی دامن سے خود چراغ اپنے
وطن نے قدر نہ کی اپنے باکمالوں کی

حمیدؔ عظیم آبادی

راسخؔ! کون راسخؔ! جس کا جواب سوا میر تقی میرؔ کے دلی میں بھی مشکل سے کوئی دوسرا نظر آئے گا۔ اگر دلی کو اکبر آباد (آگرہ) کی بدولت میر تقی میرؔ پر فخر ہے تو عظیم آباد کو بھی بلا شرکت غیرے اپنے شیخ غلام علی راسخؔ پر بجا ناز ہے اور رہے گا =

اسی مایۂ ناز، فخر بہار، جواب میرؔ و دردؔ کے کلام کا انتخاب آج قارئین کرام کے سامنے پیش کر رہا ہوں، اگر یہ انتخاب پسند خاطر ہو تو دعائے خیر سے یاد کیا جاؤں :

راسخ راسخؔ تخلص۔ شیخ غلام علی نام ولد شیخ محمد فیض عظیم آبادی۔ آپ کے خاندان کے مستند حالات تذکروں میں نہیں ملتے لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ ان کے دادا شاہجہاں آباد (دلی) سے یہاں آئے تھے اور آ کر یہیں سکونت پذیر ہو گئے :

مولد و مسکن خان بہادر سید ضمیر الدین مرحوم "سوانح راسخؔ" میں جو بہار و اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی (انجمن تحقیقات) کے سلسلے میں ۱۹۱۶ء میں انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی، تحریر فرماتے ہیں کہ "راسخؔ کا مولد موضع سائیں تھا جو بانکی پور، پٹنہ سے ۱۰ یا ۱۲ میل پر واقع ہے لیکن بچپن ہی سے عظیم آباد میں آکر رہ گئے تھے"۔ استاذی حضرت شادؔ مرحوم "نوائے وطن" میں رقمطراز ہیں کہ شیخ صاحب کی ولادت[۱] عظیم آباد

---

[۱] جناب مختار الدین آرزوؔ، ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (جلد ۲۴ - نمبر ۱، بابت ۱۹۴۶ء) اپنے تنقیدی مضمون "اشعار میرؔ پر ایک نظر" کے سلسلے میں ص ۱۶۶ میں لکھتے ہیں: "مؤلف نے شیخ غلام علی راسخؔ عظیم آبادی کا سال ولادت ۱۱۶۲ھ بتایا ہے

میں ہوئی ۔ مولد سائیں ہو یا عظیم آباد لیکن بچپن اور ابتدائی تعلیم و تربیت کا زمانہ عظیم آباد ہی میں گذرا اور زبان و تعلیم دونوں عظیم آباد والوں ہی کے زیرِ اثر رہی اور شاعری میں بھی دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ۔

سالِ ولادت و سالِ وفات

تذکرہ نویسوں کی بے خیالی سے اکثر سالِ ولادت و سالِ وفات میں اختلاف ہو جاتا ہے ۔ راسخ مرحوم کے سالِ ولادت میں کوئی اختلاف نہیں ۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ آپ کی ولادت کا سال ۱۱۶۲ھ ہجری ہے لیکن سالِ وفات میں اختلاف ہے ۔ مصنفِ گلِ رعنا، گلشنِ بے خار، کے حوالے سے سالِ وفات ۱۲۴۰ھ لکھتے ہیں اور پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدلؔ بھی گارسن دی تاسی کا حوالہ دیتے ہوئے ۱۲۴۰ھ ہی تحریر فرماتے ہیں لیکن استاذی حضرت شادؔ اور خان بہادر سید ضمیر الدین مرحوم سالِ ولادت ۱۲۳۸ھ لکھتے ہیں ۔ تاریخ وفات میں بھی تذکرہ نویس حضرات متفق الخیال نہیں ۔ کوئی ۲۲ رجمادی الاخری لکھتا ہے

لکھا ہے یہ شاد عظیم آبادی کا بیان ہے جو قابلِ قبول نہیں اور قرائن اس کے خلاف شاہد ہیں ۔ اسی طرح ان کا مولد سائیں ہونا بھی متحقق نہیں ۔" لیکن ناقد نے اپنی جدید تحقیق کی روشنی میں یہ نہیں بتایا کہ صحیح سالِ ولادت کیا ہے اور مولد کہاں تھا ! صرف تردید کر دینا تو مناسب نہ تھا ۔ کاش وہ اس کو تحقیقی ثبوت کے ساتھ تحریر فرماتے !

کوئی ۲۳ ر (پیر کا دن) بتاتا ہے اور کوئی ۲۶ ر کہتا ہے لیکن حضرت راسخ کے ایک شاگرد یاس آروی لکھتے ہیں "الحال تاریخ رحلت شیخ غلام علی راسخ بہ تلاش وتجسس کماینبغی بہ دریافت رسیدہ تاریخ بستم جمادی الاولیٰ ۱۲۳۸ھ روز دوشنبہ بودہ است"

۲۰ ر جمادی الاولیٰ ۱۲۳۸ھ میں مولانا عبدالحی مرحوم مصنف گل رعنا کے فیصلے سے اتفاق کرتا ہوں۔ گل رعنا صہ ۲۳۲ "مگر قرینہ یہ ہے کہ خمخانۂ جاوید میں نوائے وطن سے جو سال وفات نقل کیا گیا ہے وہی صحیح ہوگا" یاس آروی کی تحریر بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

مقام دفن خان بہادر سید ضمیر الدین احمد مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ آپ محلہ لودی کٹرہ میں دفن ہوئے جہاں آپ کی قبر ابتر حالت میں ہنوز موجود ہے۔ مصنف تاریخ شعرائے بہار، بھی اسی خیال کے ہمنوا ہیں۔ راقم الحروف نے بھی یہی سنا آیا ہے۔

سراپا اور وضع جناب شاد اپنے استاد حضرت فریاد کا حوالہ دیتے ہوئے نوائے وطن میں تحریر فرماتے ہیں کہ راسخ میانہ قد، گندم گوں بزرگ تھے۔ کبھی شجرئی کبھی صندلی رنگ کا کرتہ پہنتے تھے۔ اکثر کاندار ٹوپی ایک طرف جھکی ہوئی زیب سر رہتی تھی۔ یہ عالم پیری کی وضع تھی۔ جوانی میں کیا وضع تھی؟ تذکرے خاموش ہیں۔ مشاعرں میں جاتے تو اگرئی رنگ کی پگڑی کرتے پر بڑی آستینوں کی

قبا پہنے ہوئے مؤدب دو زانو بیٹھے رہا کرتے تھے۔

اخلاق واطوار شیخ صاحب نہایت مہذب اور متین بزرگ تھے۔ پیری تھی لیکن اُس پر بھی جب مشاعروں میں شریک ہوتے تو مؤدب دو زانو بیٹھتے۔ مشاعرہ شروع ہوتا تو آنکھیں بند کئے جھومتے رہتے تھے۔ جب تک مشاعرہ برخاست نہ ہو لیتا کسی کی تعریف نہ کرتے۔ جب مشاعرہ ختم ہو جاتا تو غزلوں کی حیثیت کے مطابق کسی کو ماشاء اللہ کسی کی تعریف میں سبحان اللہ اور جس کی غزل بہت پسند ہوتی تو اُن ہی الفاظ کو دُہرایا کرتے تھے۔ خود اپنی غزل پڑھتے وقت چشم پُرآب ہو جاتے اور آہستہ سے رومال اٹھا کر آنسو پونچھ لیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شعر پڑھتے پڑھتے آپ اس قدر متاثر ہو جاتے کہ طویل غزلیں میں سے صرف چند شعروں کے پڑھنے پر اکتفا کرتے۔ فطرتاً آزاد طبع تھے اور انتہا یہ تھی کہ کبھی کسی خاص محلے یا مکان کے پابند نہ رہے۔ تا عمر مکان نہ بنایا اور اس مسافر خانے کو سپنجی سرا سمجھ کر مسافرانہ زندگی بسر کی۔

آپ صوفی مشرب اور صاف طینت بزرگ تھے۔ خانقاہوں اور درگاہوں میں اپنا کلام لطف اندوز ہو ہو کر پڑھتے اور یہ اُن ہی صحبتوں کا اثر تھا کہ اُن کی غزلوں میں معرفت اور تصوف کا

عنصر بہت غالب تھا۔

طبیعت میں استغنا اور بے نیازی پرلے درجے کی تھی ہمیشہ زمانے کے شاکی رہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے دن آرام سے نہیں گذرے۔ مجبور ہو کر ترکِ وطن کیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اپنی ذی کمالی پر افتخار اور ناز بھی تھا۔ اور بالکل بجا تھا۔ جب تک جوہری اپنے موتی کی خود قدر نہ کرے اور اُس کی آب و تاب کی ضیا پاشی کو بچشمِ وقیع نہ دیکھے تو بازارِ سخن میں دوسرے اہلِ بصیرت کب اُسے عزت اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور اگر دیکھیں بھی تو خود اُسے کم نظر سمجھیں گے۔ لہذا کمال انسان کو خوددار اور اپنا آپ قدرداں بنا دیتا ہے۔ اِس سے حضرت راسخ بھی معزز تھے اور کیونکر رہتے! چنانچہ فرماتے ہیں:۔

راسخ کہانیاں تو ہم نے بہت سنی ہیں ؛ انداز اور ہی ہے پر تیری داستاں کا

زندہ ہے نام میر راسخ سے ؛ کون ہے شاعروں میں ایسا آج

مایۂ دارِ سخن اب کون ہے ہم سا راسخ ؛ شاہِ اقلیم معانی جو ہے ہم میر کی طرح

اُستادِ فنِ ریختہ راسخ ہے بعدِ میر ؛ اب شاعروں میں ہند کے ایسا کہاں نغز

اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہاں تک لکھ جاتے ہیں:۔

نظیری اور شفائی کا ہے بدل راسخ ؛ یہ اُس کا فخر نہیں گر نظیر میر ہوا

وہ بزمِ شعر کیا جس میں آویں حضرت راسخ ؛ کہ آنا اُن کا آنا ہے شفائی کا نظیری کا

تعلیم و تربیت

شیخ صاحب کی تحصیلِ علمی کے باب میں تمام تذکرے خاموش ہیں۔ کوئی تفصیلی حالت معلوم نہ ہو سکی لیکن کلام کے مطالعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اُس وقت عظیم آباد ذی علم حضرات کا مسکن تھا اور یہی مشغلہ اگلے بزرگواروں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ شیخ صاحب کا مسکن عظیم آباد میں رہ کر علمی خزانے کے جواہر ریزوں سے خالی رہتا۔ آپ کو علم تصوف سے خاص شغف تھا۔ کلام کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم فلسفہ اور الہیات کی کتابوں کا بہت ہی غائر مطالعہ کیا تھا۔

شیخ صاحب کے اساتذہ

خان بہادر ضمیر الدین مرحوم اور جناب شاد اِن کو مرزا خیر (تلمیذ تحقیق) کا بھی شاگرد لکھتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنے بالکل ابتدائی کلام پر مرزا خیر سے اصلاح لی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم (مصنفِ آبِ حیات) شیخ صاحب کو سودا کا شاگرد تصور کرتے ہیں۔ آبِ حیات صفحہ ۱۷۲ نقل "راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ بہت سنجیدہ کلام ہے۔ پرانے مشاق تھے اور سب اُدھر کے لوگ انہیں استاد مانتے تھے۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا، کوئی شعر سنایئے!

انہوں نے پڑھا ؎

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

مرزا نے اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ ایسا ہی معاملہ جرأت سے ہوا تھا۔" لیکن اُستاد مرحوم حضرت شاؔد ان کو میرؔ کا شاگرد لکھتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے۔ میرؔ کی شاگردی پر راسخؔ نے اکثر شعروں میں اظہارِ فخر و مباہات کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

؎ راسخؔ کو ہے میرؔ سے تلمذ ٭ یہ فیض ہے اُن کی تربیت کا

؎ کروں کیونکر نہ میں راسخؔ مباہات ٭ کہ ہیں اُستاد میرے حضرت میرؔ

تذکرۂ سخن شعرا میں مولوی عبدالغفور نساخ مرحوم نے راسخؔ کو مرزا محمد علی فدوی کا شاگرد لکھا ہے جو حضرت شاہ رکن الدین عشق رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدتمند شاگرد تھے۔ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں راسخؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک بیاض موجود ہے۔ اس میں کے اکثر اشعار مطبوعہ دیوان میں نہیں ہیں۔ ان اشعار کے حاشیے پر خود راسخؔ نے "نباید نوشت" لکھ دیا ہے۔ اُن اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے جس سے فدوی کی شاگردی کا اعتراف پایا جاتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:۔

؎ شاگرد گو ہیں حضرتِ فدوی کے بے شمار
راسخؔ ہیں ایک ہم بھی، دلے کس شمار میں

کس سنہ میں میرؔ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا، صحیح پتا نہیں چلتا لیکن قرینہ ہے کہ پچاس سے عمر تجاوز کر گئی تھی کہ آپ کو میرؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پچھم کے سفر سے ساٹھ کی عمر میں عظیم آباد واپس آ گئے تھے۔ "نوائے وطن" میں راسخؔ کی میرؔ سے شاگردی کا حال یوں قلمبند کیا ہے کہ شعرائے دہلی کے شوقِ ملاقات نے اِن کو پھر وطنِ مالوف سے نکلنے پر مجبور کیا۔ زمانہ دہلی کے عروج کے اوراق الٹ چکا تھا۔ میرؔ و مرزاؔ بھی دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ شیخ صاحب بھی میرؔ کی ملاقات کے شوق میں لکھنؤ پہونچے لیکن وہ زمانہ وہ تھا کہ میرؔ صاحب گوشہ گیر ہو چکے تھے۔ شیخ صاحب گھڑیوں دروازے پر کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ماما کچھ سودا سلف لینے کو نکلی۔ شیخ صاحب کی تراش خراش اور وضع و لباس دیکھ کر سمجھ گئی کہ پردیسی ہے۔ اُس نے دریافتِ حال کیا۔ مقصد سے مطلع ہو کر یہ کہتی چلی گئی کہ سرکار اب کسی سے ملاقات نہیں کرتے۔ یہ کھڑے کچھ دیر سوچتے رہے۔ جب وہ

حاشیہ صـــ۲۳ـــلہ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ راسخؔ شاہ نور الحق تپاںؔ (پھلواروی) کے شاگرد تھے۔ "ذالہامات شاد" (مولوی عبدالمالک آروی، صـــ۲۹ـــ) قرین قیاس ہے کہ فارسی کلام پر حضرت تپاںؒ سے اصلاح لی ہوگی۔ حمید عفی عنہ

واپس آئی اور مکان میں جانے لگی تو آپ نے یہ مطلع لکھ کر اُس کو دیدیا اور کہا کہ یہ پرزہ اپنے سرکار کو دیدینا۔ میر صاحب وہ مطلع پڑھتے ہی باہر چلے آئے اور فرمایا کہ کیوں زحمت فرمائی ہے اور فقیر کو کیوں یاد کیا ہے۔ ہاں! وہ مطلع یہ تھا۔ ؎

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا: آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

شیخ صاحب حاضر ہونے کی غرض بیان کی۔ دروازے میں بوریا بچھایا گیا۔ میر صاحب نے جا بجا سے دیوان دیکھا اور خوش ہو کر فرمانے لگے کہ تمہارا کلام گویا میرا دیکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کسی جگہ اصلاح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ جب شیخ صاحب نے بہت اصرار کیا کہ اگر آپ اپنے قلم سے کسی شعر کی اصلاح فرمادیں گے تو مدت العمر میرے فخر کا باعث ہوگا۔ میر صاحب نے مندرجہ ذیل مطلع کی یوں اصلاح فرمائی:۔ ؎

مرتے دم اُن کا ذکر جب آیا زبان پر: نیند آگئی ہمیں تب اسی داستان پر

اصلاح

تا خواب مرگ ذکر تھا اُن کا زباں پر: " " " تو " "

مندرجہ بالا سطور کے پڑھنے سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ جب راسخ، میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ اصلاح محض تبرکاً اور تیمناً لی گئی تھی۔ میر صاحب کے سے نکتہ رس اور باریک بین اور ماہر زبان و فن کا یہ فرمانا کہ

کلام گویا میرا دیکھا ہوا ہے اور اصلاح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، صاف بتا رہا ہے کہ راسخ کلام کیسا تھا اور راسخ کیسے باکمال شاعر تھے۔ میر صاحب کی تنک مزاجی اور خودداری پوشیدہ نہیں، پھر ایسے بزرگ کا کسی کے کلام کے متعلق یہ کہنا، اس کی ذی کمالی کی مستند دلیل ہے۔ میر صاحب اپنے کسی ہمعصر کی تعریف تو کرتے نہ تھے اور کجا کہ ایک پردیسی، ناآشنا غریب الوطن بہرکیف! مرزا ہوں یا میر صاحب بہ ہر صورت راسخ کی ذی کمالی مسلّم !!

راسخ کے تلامذہ

راسخ جیسے کامل الفن استاد کے شاگردوں کی فہرست یقینی طویل ہونی چاہیے تھی اور ہوگی لیکن اس دور کے تذکرہ نویسوں نے جب خود راسخ کا حال لکھنے میں کوتاہ دستی سے کام لیا ہے تو کجا ان کے شاگرد اور کجا ان کے تذکرے۔

راسخ مرحوم خود فرماتے ہیں ؎

میر کے بعد ہیں استاد فنِ ریختہ ہم ؎ اپنے شاگرد سبھی صاحبِ دیوان ہوئے

بہرکیف! مجھے چند حضرات سے زیادہ کے احوال نہ مل سکے اس لئے ان ہی چند ناموں پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) حکیم:۔ حکیم احمد حسین عرف لکھی سوداگر عظیم آبادی خلف شیخ فیض بخش تلمیذِ راسخ۔

نمونۂ کلام :- کچھ آج الجھتی ہی ہوا سے مری زنجیر
کیا آئی ہوا کا کلِ پیچاں سے الجھ کر

(۲) فرحت :- خواجہ فیض اللہ معروف بہ شاہ غلام مخدوم عظیم آبادی
سلسلۂ ابوالعلائیہ سے منسلک تھے۔ راسخ عظیم آبادی سے
تلمذ تھا۔ نمونۂ کلام (فارسی)

درساغرِ پُر بادہ و در دیدۂ پرخون :: ہر جا اثرِ نرگسِ جادوے تو دیدم

اردو

کل چمن میں مری اشکوں سے بھر آئیں آنکھیں :: یاد نرگس نے مجھے آن کی دلائیں آنکھیں

(۳) محزوں یا مفتوں :- حکیم ابوالحسن باشندۂ عظیم آباد۔ فن طب
میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی حذاقت مسلمۂ خاص و عام تھی۔
شاعری میں بھی اچھی خاصی شہرت حاصل کی تھی۔ راسخ کے
شاگرد رشید تھے۔ نمونۂ کلام :-

آشیاں اپنا اٹھالے یاں سے ورنہ عندلیب :: خندۂ گل ایک دن برقِ چمن ہو جائے گا
ہم جو چاہیں بھی کچھ اُن سے تو نہیں کچھ چاہیں :: ما سوا اسے نہیں کچھ کام طلبگاروں کو

(حیاتِ فریاد مصنفۂ شاد میں مفتوں تخلص ہی لیکن تاریخ شعرائے بہار
کے مصنف نے محزوں لکھا ہی۔)

(۴) محسن :- خواجہ محمد حسن خلف خواجہ آفتاب احراری نقشبندی
رئیسِ عظیم آباد۔ شاگرد راسخ عظیم آبادی۔ نمونۂ کلام

ناوکِ مژگاں سے تیرے منہ نہ موڑو نگا کبھی :: صورتِ غربال گرچہ یہ تن ہو جائے گا

بس وہ اب دور سے بھی اک نظر دیکھ چکے ؛ پاسِ اغیار یہی ہو تو اِدھر دیکھ چکے

(۵) مراد :۔ مرزا مراد بخش عرف مرزا احمد ولد ناصر محمد خاں۔ شاگردِ راسخ۔ تیئس ۲۳ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ نمونۂ کلام :۔

ہو عشق و عقل سے ہر دم مجادلہ دل کا ؛ کشاکشی میں پڑا ہو معاملہ دل کا

جان لب ہوں میں خماروں سے اور آتی ہو بہار ؛ وقت ہو ساقی اگر جام میں صہبا کیجے

(۶) مہدی :۔ نواب مہدی علی خاں خلف نواب جعفر حسن خاں فیض۔ رئیسِ عظیم آباد۔ شاگردِ راسخ عظیم آبادی۔ نمونۂ کلام ؎

جب شگفتہ لالۂ خونیں کفن ہو جائے گا ؛ بیستوں پر تازہ خونِ کوہکن ہو جائے گا

ہو محیط اس مرتبہ تک فیض اُس کے نور کا ؛ ہر شررِ سنگ میں ہمسر چراغِ طور کا

(۷) یاس :۔ مولوی انور علی۔ مفتیٔ عدالت قصبہ آرہ۔ ولد شیخ محمد حیات۔ شاگردِ راسخ عظیم آبادی۔ مصوری نغمہ پردازی اور ساز نوازی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے مگر بعد تحصیل علوم شرعیہ ان دلچسپیوں سے الگ ہو کر کمال زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی۔ فارسی کا دیوان چھپ گیا تھا۔ سال پیدائش ۱۲۰۷ھ اور سال وفات ۱۲۶۲ھ۔ نمونۂ کلام :۔

آخر اُس کے سب تماشائی ہوئے ؛ جو ترا محو تماشا ہو گیا

عشق کی راہ میں جب تک نہ ہو جی کا نقصاں ؛ یاسؔ تب تک نہیں ہوتا کوئی کامل ہرگز

یاں طرزِ سخن میں ای یاس ✽ راسخ کے یادگار ہیں ہم
مرغانِ چمن سب ہی ثناخوان ہیں گل کے ✽ ہم یہ نہیں معلوم کہ عصر کان میں گل کے
کیونکر کہیں میرے تئیں رسوا نہ کریں گے ✽ گردیدہ تو دل یہ ہیں تو کیا کیا نہ کریں گے

تصانیف راسخ

کلیاتِ راسخ (مطبوعہ) :- اس کلیات میں چودہ مثنویاں، متعدد قطعے، نو، دس قصیدے، رباعیاں اور معتد بہ غزلیں ہیں قلمی بیاض میں ابتدائی کلام بھی ہے لیکن اور کسی تصنیف کے متعلق سر دست تحقیق نہ ہو سکی۔

جستجوئے معاش میں راسخ کی شہر گردی

شیخ صاحب کے والد اتنا سرمایہ چھوڑ گئے تھے کہ تیس برس کی عمر تک شیخ صاحب کی زندگی فراغت سے بسر ہوئی۔ جب وہ سرمایہ خرچ ہو گیا تو اب تنگدستی کا سامنا ہوا اُس وقت کے اُمراء ایسے نہ تھے کہ راسخ کی خدمت نہ کر سکتے ہوں لیکن لعل جب تک بدخشاں سے باہر نہیں جاتا، اُس کی قدر نہیں ہوتی۔ ہزار صاحبِ کمال ہو لیکن وطن میں اُس کی قدر نہیں ہوتی۔ پٹنہ والوں نے راسخ کی بھی قدر نہ کی۔ ناچار ترکِ وطن کیا اور دہلی کی راہ لی۔ پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔ غازی پور پہنچے وہاں کے لوگوں نے آپ کی تشریف آوری کو غنیمت سمجھا اور خاطر خواہ قدر و منزلت کی۔ آپ وہاں تین سال اقامت پذیر رہے۔ پھر وطنِ مالوف کو لوٹ آئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد پھر

دہلی کے ارادے سے وطن چھوڑا۔ دہلی تو پہونچے لیکن دلی اُجڑ چکی تھی اور وہاں کا بازار سرد ہو چکا تھا۔ دو چار برس اِدھر اُدھر سرگرداں رہے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ پہونچے۔ وہاں بھی سات سال رہے۔ لیکن وہاں بھی مدعا پورا ہوتا نظر نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر ۱۲۲۲ھ میں عظیم آباد واپس آئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد مونگیر، بھاگلپور اور مرشد آباد میں قیام فرماتے ہوئے کلکتہ پہونچے۔ مولوی راشد مفتی کے مہمان رہے۔ کلکتہ میں قاضی سراج الدین علی خاں قاضی القضاۃ نے بھی آپ کو اپنے دامن دولت کا سہارا دے کر چند سے کلکتہ میں روک رکھا۔ بالآخر ۱۲۳۲ھ میں عظیم آباد آئے اور اب کے آئے تو پھر قدم باہر نہ نکالا اور یہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے۔

راسخ کا مذہب

راسخ کو سنّی (اہل سنت والجماعت) سنّی کہتے ہیں اور شیعہ حضرات شیعہ، راسخ نے اکثر مقامات پر حضرت علیؓ کی منقبت میں اشعار لکھے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور خلفائے راشدین کی بھی منقبت لکھی ہے۔ اُن کے کلام کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ صوفی مشرب سنّی تھے۔ اگر راسخ شیعہ ہوتے تو ایک سنّی کو اپنا پیر و مرشد نہ بناتے۔ راسخ مرحوم نے اپنے پیر و مرشد کو جو خط لکھا ہے وہ اس وقت تک خانقاہ شریف (بڑی خانقاہ)

پھلواری میں محفوظ ہے۔ اب خود راسخ کے موقلم سے تصویر کے اصلی رخ کی مرقع کشی ملاحظہ کی جائے۔ مثنوی نورالانظار میں فرماتے ہیں:-

اکمل و اشرف و افضل ہے وہ | ذات کا مظہر اول ہے وہ
ہستی اُس کی سبب نظم کل | زہے وہ قافلہ سالار رسل
نعت ایسے کی کہاں ہو مجھ سے | وصف اُس کا نہ بیاں ہو مجھ سے
آل کی اُس کے ہے کیا قدر رفیع | دوستی اُن کی ہے میری تو شفیع
اُس کے اصحاب ہیں سب نیک شعار | ایک کا ایک انیس و غمخوار
ہمہ تن صدق و صفا ہے کوئی | عادل و اہل حیا ہے کوئی

مثنوی اعجاز عشق میں لکھتے ہیں:-

اُس کے اصحاب جملہ مہر و وفا ٭ صاحب علم و صدق و عدل و حیا

شعر مذکورہ بالا میں راسخ نے چاروں خلفائے راشدین کی اُن کی خاص صفتوں کے ساتھ منقبت کی ہے جو ارباب فہم سے مخفی نہیں ہے لہذا توضیح بیکار!

راسخ اور موسیقی

شاعری کے علاوہ فن موسیقی کے بھی ماہر تھے جب تک کانوں میں سُروں کی آواز نہ جاتی، طبیعت موزوں نہ ہوتی۔ نغمہ و سرود اور شعر و شاعری یہی دو ان کے دلچسپ مشغلے تھے۔ خود فرماتے ہیں

بجز فن شریف شعر راسخ ٭ نہیں مرغوب کوئی فن ہمارا

اس کے علاوہ طبیعت بھی اتنی گداز پائی تھی کہ شعر کے پڑھتے وقت آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ طبیعت کا یہ گداز بہ قرینۂ غالب کسی کے تیر نظر کا عطیہ تھا لیکن آخر کار عشق مجازی کا یہی سوز عشق حقیقی کی دشوار گذار راہ کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوا۔ راسخ کی شاعری کے تبصرے کے باب میں اس مجمل کی تفصیل عرض کی جائے گی۔

موازنۂ کلام راسخ

راسخ	میر
تربیت وجہ ترقی ہے جو ہو استعداد قابلیت ہو تو پھر قطرہ بھی دریا ہو جائے	جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا
بھلا کہو کہیں ایسے سے اپنا کیونکر حال کہ جب وہ سامنے ہو طاقت بیان نہ رہی	کہتے تھے اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک پر وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

اس مضمون کا ایک اور رُخ ملاحظہ ہو:-

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اُسے کہیں گے
پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
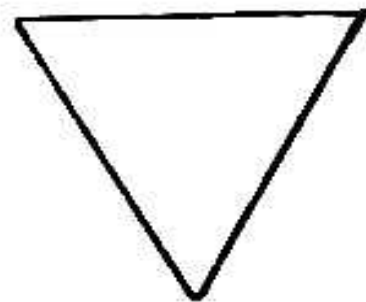
راسخ مثنوی ناز و نیاز میں فرماتے ہیں:-

مت کر دعشق کا دعوی راسخ	ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر

کیا ربط محبت سے اُس آرام طلب کو
عشق تم کو نہیں زیبا راغ
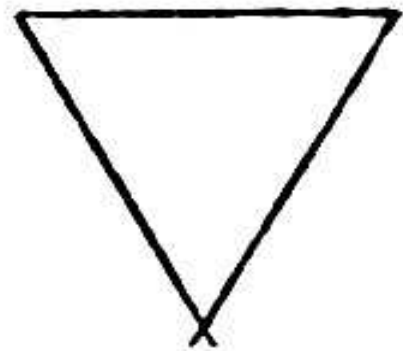
رنج کش عشق کے کب ہے صاحب
تم تو آرام طلب ہو صاحب

سایہ ہی ڈھونڈھو ہو سونے کے لئے
دل خوش چاہو ہو رونے کے لئے

کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
دل ہو نہ گیا گداز تیرا

الفت سے ساز کر کے اُس کو
آتا ہی دل گداز کرنا

ایک تھے ہم دے نہ ہوتے بت اگر
اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا

پھر اس مضمون کو یوں کہہ جاتے ہیں:-
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوئیں تو پھر حجاب کہاں

اسی مضمون کو حضرت دردیوں کہہ جاتے ہیں:-
حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہیں
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

پردہ ضرور کیا تھا جب سب تمہیں تھے حجاب
حیرت یہ ہے کہ ہم کو کیوں درمیاں بنایا

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہو جائیگی
آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہو جائیگا
پائیگا اُس بے نشاں کا کچھ تو اے راغ نشاں
آپ کھو کر جو بے نام و نشاں ہو جائیگا

پردہ رخ معشوق کا ہستی ہے ہماری
کیا اپنے تئیں بیچ سے مشکل ہے اٹھانا

احوال میر جی کا مطلق گیا نہ سمجھا
تمھاری بات اے راغ سمجھ میں کس کی آئے

کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر رو کر

گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

راسخ مثنوی حسن و عشق میں یوں زمزمہ پرداز ہیں:-

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں اور صحرا صحرا وحشت ہے

جوگی بنا کامروپ آخر بیٹھا وہ رنگ روپ آخر
دریا دریا رلایا اسکو : صحرا صحرا پھرایا اسکو

وہ محو ناز ہی رہے آئے نہ اس طرف
میں منتظر تو جان سے گیا ان کا کیا گیا

جی گیا میرا غموں کے مارے
کیا گیا ناز کا تیرے بارے
(مثنوی ناز و نیاز)

کی اک ہائے اور اس کو غش آگیا
گیا اس کا دل عشق کا کیا گیا
(مثنوی کشتن عشق)

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے
بھول تو ہم کو گئے ہو یہ تمہیں یاد رہے

سینے میں ہو کے دل دھڑک اٹھا
کہیں شعلہ ہوا بھڑک اٹھا
بھولے تو ہو لیک یہ رہے یاد
یا جاتا رہا جی سے گریہ ناشاد
تو یاد بہت کیا کروگے
ہاتھ اپنا سدا ملا کروگے
(مثنوی مکتوب شوق

دیکھئے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
شام

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے

دل اپنا تو بجھا سا دیا ہے جانِ چراغِ سحر دیکھیے گیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

(مثنوی دریائے عشق)

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں عشاق کا نیاز ہوا
کہیں اندوہِ جانگداز ہوا
حسرت آلودہ آہ تھا یہ کہیں
شوق کی اک نگاہ تھا یہ کہیں
واں تپیدن ہوا جگر کے بیچ

(مثنوی جذب عشق)

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق
شمع ایوانِ کبریا ہے عشق
آبِ گوہر ہے اور آتشِ سنگ
ہر جگہ اس کا اک نیا ہے رنگ
خون ہو برسا ابرِ مژگاں سے
ٹپکا آنسو ہو چشمِ گریاں سے
تبِ غم ہو کے استخواں میں رہا
ضعف ہو جانِ ناتواں میں رہا
گاہ رسوا کہیں رہا اک عمر
کہیں پردہ نشیں رہا اک عمر
گاہ محفل نشینِ ناز ہوا
کہیں سر تا قدم نیاز ہوا
کوچۂ تو سے نالہ ہو نکلا
خاکِ گلشن سے لالہ ہو نکلا
روشن اس سے ہے جاں کا کاشانہ
ہے پتنگا اسی پہ پروانہ
بزمِ گیتی اسی سے ہے پُرنور

یاں تبسم ہے زخم زر کے بیچ — ذرہ تا مہر ہے اسی کا ظہور
اک زمانے میں دل کی خواہش تھا — بلبل آشفتہ ہے سدا اس کی
اک سمے میں جگر کی کاہش تھا — ہے گل تازہ کو ہوا اس کی
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — سینے میں ہو کے دل دھڑک اٹھا
بیستوں میں شرارِ تیشہ رہا — کہیں شعلہ ہوا بھڑک اٹھا
خارخارِ دلِ غریباں ہے — گل داغِ جگر فگاراں ہے
انتظارِ بلا نصیباں ہے — خانۂ زیراں کنِ ہزاراں ہے

(مثنوی شعلۂ عشق)

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت سے ہے انتظامِ جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں
محبت ہی ہے تحت سے تا بہ فوق

(مثنوی حسن و عشق)

اے عشق جہاں نہاں ہے تو ہی
پنہاں تو ہی عیاں ہے تو ہی
کیفیتِ اولیں ہے تو ہی
وجدانِ دلِ حزیں ہے تو ہی
تو جان ہے جسمِ ناتواں میں
ہووے جو نہ تو تو پھر کہاں میں
ہے شور ترا ہر انجمن میں
رونق ہے تجھ سے ہر چمن میں
تو نور ہے ارض کا سما کا
ہے جاذبہ تو ہی کہربا کا
جذب اس میں اگر ترا نہ ہووے

زمین آسماں سب ہیں لبریز شوق — پتھر آہن رُبا نہ ہووے
اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں — تو شعبدہ بازی پر گر آوے
یہی ذرے کی جان نومید میں — تنکے کو پہاڑ کر دکھاوے
اسی سے دلِ ماہ ہے داغدار — تو چاہے تو قطرہ ہووے دریا
کتاں کا جگر ہے سراسر فگار — تو چاہے تو شہر ہووے صحرا
اسی سے قیامت ہے ہر چار اور — تو عقل کا ہوش کھو سکے ہے
اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور — جو چاہے سو تجھ سے ہو سکے ہے
محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو — تو وہم و خیال سے پرے ہے
محبت سے وہ ہو جو ہرگز نہ ہو — تو قال و مقال سے پرے ہے

(مثنوی معاملات عشق)

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — موہوم نہ تو نہ تو مخیل
حق اگر پوچھو تو خدا ہے عشق — ازل سے پرے ہے تیرا ازل
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — محرم ترے ہیں ملا کہیں ہیں
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ؟ — تیرے ہی تئیں خدا کہیں ہیں

موجودہ زمانے میں تذکروں کا سب سے روشن اور ضروری باب موازنہ کلام سمجھا جاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ راسخ کے کلام کا دیگر اساتذہ کے کلام سے موازنہ کیا جاتا لیکن طوالت مانع ہے کیونکہ ابھی اس دیباچے کے دو ایک ضروری باب باقی ہیں، اس لئے ناظرین کرام

سے معذرت خواہ ہوں، تاہم میں نے ناخدائے سخن حضرت میر تقی میرؔ کے شعروں کے ہم معنی راسخؔ مرحوم کے چند اشعار درج کر دیئے ہیں، جن شعروں کے پڑھنے سے ارباب بصیرت پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ راسخؔ کا کلام دنیائے ادب میں کس اعزاز و احترام کا مستحق ہے۔ مجھے حضرت راسخؔ کے ہم وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لئے اگر کچھ زیادہ لکھوں تو ممکن ہے کہ دامن وطن پرستی کی گرفت کی جائے۔ لیکن پھر بھی اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اہل نظر حضرات کوتاہ بینی سے کام لے کر انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اور ہم وطن ارباب بصیرت کے سامنے اپنا ایک شعر پیش کرنے کے بعد میں اس باب کو ختم کرتا ہوں۔

ناوکِ نازکی اغیار نوازی توبہ
ہائے میرا وہ پشیمان تمنا ہونا

راسخؔ کے دور میں عظیم آباد میں اردو اور خود راسخؔ کی زبان

اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ سلطنت مغلیہ کے شروع عہد میں یہ زبان کس طرح دلی کے تخت و تاج کا کوہِ نور بنی اور شاہ جہانی اردو جس کا دوسرا نام اردوئے معلیٰ ہے کیوں کر اس ملک کے اظہار مقاصد کی ترجمان بن کر لوگوں کی زبانوں پر حکومت کرنے لگی۔ شاہ جہان کے دور میں

اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہونے لگا اور پھر اورنگ زیب
کے وقت میں تو یہ عالمگیر ہو گئی۔ یہ وہی دور ہے کہ عظیم آباد
میں مرزا عبدالقادر بیدل سا باکمال پیدا ہوتا ہے۔ اور فارسی
کے ساتھ ساتھ اردو کا بھی دلدادہ بن جاتا ہے۔ اور یہ شعر پڑھتا
ہوا با دلِ ناخواستہ اپنے وطن کو خیرباد کہتا ہے ؎

سرا او پر جب کوئی نہیں تو دشمن آپن بیس
پٹنہ نگری چھوڑ دین بیدل چلے بدلیس

شعر حسرت کی تصویر اور دلی جذبات کا صحیح مرقع پیش کرتا ہے۔
اس شہر اور اس صوبے میں نہال اردو اس وقت سرسبز و شاداب
تھا جبکہ دلی کے سوا اور کہیں اس کی نشو نما محدود تھی۔ اور ہماری اردو
اس کی زبان سے گویا ہوئی جو عالمگیری شاہزادوں کا اتالیق واستاذ
اور دکھن و دلی کے سخنداروں کا سرتاج تھا۔

بیدل دلی سدھارے تو سمجھا گیا تھا کہ پٹنہ کا ادبی وقار ختم ہو گیا
لیکن ابھی اس شہر کا نصیبا جاگ رہا تھا، مرزا موسوی خاں فطرت[۲]
دلی سے یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے قیام سے
پٹنہ دلی کا ایک ٹکڑا نظر آنے لگا۔ فطرت کے آنے کے بعد تو ہمارا

۱؎ بیدل پٹنے سے چل کر جونپور ہوتے ہوئے دلی پہونچے اور وہاں شاہزادگانِ عالمگیر (اعظم و معظم) کے استاد و اتالیق مقرر ہوئے۔ اور ۱۱۳۳ھ میں وہیں کی خاک میں ان کی خاک مل گئی۔

۲؎ مرزا موسوی خاں فطرت بہ زمانۂ عالمگیر صوبہ بہار کے صدر دیوان مقرر ہو کر پٹنہ آئے۔

یہ شہر دلی والوں کا گھر آنگن ہو گیا۔ وہاں کے اکثر امرا کو اس صوبہ اور شہر میں آل تمغا اور جاگیریں ملیں اور وہ دلی چھوڑ کر پٹنے میں آ بسے اور یہاں بھی کسے گئے۔ قلعۂ معلی کی آواز یہاں بھی گونجی اور پھیلی اور شہزادہ عظیم الشان کے قدموں کی بدولت یہاں کا پرانا قلعہ نیا اور آباد ہونے اور پٹنہ، عظیم آباد بننے لگا۔ اسی زمانے میں یہاں کی خاک سے ملا محمد علیم تحقیق سا محقق اٹھا۔ اس نے موسوی خاں فطرت کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور عظیم آباد کی روشن شمع اردو کو گل نہ ہونے دیا۔ ۱۱۶۲ھ میں یہ ہمارا محقق زیر خاک ہوا اور اسی سال شیخ غلام علی راسخ سا کامل استاد فن اور جواب میر درد پیدا ہوا۔ راسخ کے بعد فریاد اور میر شاد و خیال اور دیگر بزرگواروں نے عظیم آباد کے اس ادبی وقار کو اپنی جگہ پر قائم رکھا۔

بہار کی بھی ہے شرکت بہار گلشن میں   لہو سے ہم نے بھی سینچا ہے باغ اردو کو

(حمید عظیم آبادی)

اس سلسلے میں اگر اور چند جملے نہ عرض کروں تو اخفائے حقیقت حال کا الزام یقینی میرے سر رہ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شہر کی زبان اب گرتی اور بگڑتی جاتی ہے لوداپنے پرستاروں کے ہاتھوں سے نکل کر اپنا اگلا وقار کھوتی جاتی ہے۔ ہماری بد مذاقی نے اس کے آئینہ نما رخسار کو گرد آلود کر دیا اور ہماری بے پروائی نے اس کے رخ روشن کو چھائیں دار بنا دیا۔ ہم میں اب ایسے بھی ہیں جو

اسے پاک و صاف رکھنا بے سود جانتے ہیں اور اس کی دیکھ بھال کو بے نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس کے پرستاروں اور آئینہ داروں (ادبا و شعراء) پر نظر کرنا تضیع اوقات اور لاحاصل سمجھتے ہیں۔ بے حسی نے یہیں اتنا نکما کر دیا کہ سخندانوں اور ادیبوں کی ترقی محدود ہو گئی۔ وہ ناقدریِ زمانہ کے شکار ہو کر ہمتیں ہار بیٹھے اور گوشہ گیر ہو گئے۔ علاوہ بریں یہ چند نفوس کہاں تک عوام کو اپنا ہمنوا بنا کر زبان کی اصلاح کر سکتے اور لیلائے اردو کے رخِ تاباں کو غبار آلود ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ بدنصیبی سے اس عام بد مذاقی میں ہمارے خواص بھی شریک ہیں۔ بہرکیف ؟ راسخ کی زبان وہی تھی جو اس وقت دلّی والوں کی زبان تھی۔ ہاں ! اتنا فرق ضرور تھا کہ وہاں کی اردو زیادہ تر فارسی کی منت پذیر ہو رہی تھی اور یہاں کی اردو بھاکا یعنی اپنی اصلیت کی طرف زیادہ جھکی ہوئی نظر آتی تھی۔ راسخ مرحوم کا دیوان دیکھ کر میر صاحب کا یہ فرمانا کہ تمہارا کلام تو میرا دیکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ جو میرؔ کی زبان تھی وہی راسخ کی۔ انتخاب کلام راسخ جسے آپ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے، میرے بیان کی خود تائید کرے گا۔ ضمناً مولانا عبدالحئی مرحوم مصنف "گل رعنا" کی تحریر سے ایک جملہ پیش کر کے اس باب کو ختم کرتا ہوں "گل رعنا" ص ۲۳۱ "میرے نزدیک ان کے (راسخ کے) معاصرین میں سے کسی کا بھی کلام زبان کی پاکیزگی

اور بیان کی خوش ادائی میں ان کا جیسا صاف وستھرا نہیں ہے۔"

خصوصیاتِ عصرِ راسخ

(۱) راسخ کے دور سے قبل ایہام گوئی کا چرچا تھا، اس دور میں اساتذہ نے اس کو فضول سمجھ کر کلام کو اس سے پاک کرنا شروع کیا۔

(۲) اس دور سے پہلے بھاشا کے الفاظ زیادہ استعمال کئے جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھاشا کے الفاظ کے ساتھ عربی فارسی کے الفاظ اور فارسی کے محاوروں کے ترجمے شعروں میں بہ کثرت نظم کئے جانے لگے، جس سے زبان کی وسعت اور چاشنی بڑھ گئی۔ مگر معرب لفظیں اور بھدی ترکیبیں بھی ترک کی جانے لگیں۔

(۳) ہندی الفاظ اور محاورات میں کافی طور پر تغیر و تبدل ہونے لگا۔

(۴) اردو شاعری ہندی کا چولا اتار کر زیادہ تر فارسی قالب میں ڈھلنے لگی۔

(۵) نئی نئی بحریں ایجاد ہونے لگیں۔ اقسام شاعری کے جملہ اصناف کا رواج روز افزوں ہوتا چلا۔

المختصر زبان اردو کے دائرۂ ترمیم و ترقی کے وسیع ہونے کا دور اسی دور سے شروع ہوتا ہے۔

راسخ کے کلام پر ایک سرسری اور اجمالی نظر

مولانا حسرت موہانی
رسالۂ اردوئے معلی

بابت مئی ۱۹۰۷ء میں تحریر فرماتے ہیں "راسخ کی مثنویوں کا انداز میر کی مثنویوں سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں میں تمیز بھی مشکل سے ہو سکتی ہے"۔ جناب سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی "تاریخ شعرائے بہار" میں لکھتے ہیں: "ابتذال سے ان کا کلام بالکل پاک ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ تصوف کا رنگ بہت نمایاں ہے اور فلسفیانہ رنگ بھی اکثر پایا جاتا ہے۔ ثقاہت و متانت میں یہ اپنے استاد میر سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں اور عشق حقیقی کے پاک جذبات کے بیان میں یہ اُن سے آگے ہیں۔ راسخ نہ صرف سیرِ فخر شعرائے بہار ہیں۔ بلکہ اقلیم سخن میں میر و درد کی طرح تمام ہندستان کے لئے مایۂ افتخار ہیں"

حضرت شاد "نوائے وطن" میں یوں رقم طراز ہیں:۔
خطۂ بہار کو اس عزیز کے نام نامی سے افتخار اور اس کی استادی پر مباہات ہے۔ اس شہسوار میدانِ بلاغت نے سمندِ سخن کو ایسا تیز بڑھایا کہ ساتھ والے گردِ قدم تک نہ پہونچ سکے۔ اور اس کا شہباز فکر ایسا بلند ہوا کہ شکار گاہِ معنی کے صید گیر منہ دیکھ کر رہ گئے۔

اب آئیے ہم اور آپ خود ذرا راسخ کے کلام کو جانچیں اور پرکھیں۔ حضرت راسخ کی طبع رسا کی جولانگاہ صرف غزل

یا مثنوی تک محدود نہ تھی بلکہ ان کا سمند فکر ہر صنف شاعری کے میدان میں یکساں گام زن نظر آتا ہے۔ قصیدہ ہو یا رباعی، مرثیہ ہو یا واسوخت، ان کا شبدیز قلم اسی طرح طرارے بھرتا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح ہر کامیاب شاعر ایک خاص صنف کا مالک ہوتا ہے اور اسی میں اس کی فطری صلاحیت کا جوہر زیادہ نمایاں ہوتا ہے، اُسی طرح راسخ کا کلام بھی فن غزل گوئی کی تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کا آئینہ دار ہے۔ غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طویل غزلوں میں سے چُنے چُنے اشعار چھانٹ کر جمع کر دئے گئے ہیں۔ غزلوں کے بعد مثنویوں کا درجہ ہے، لیکن ان کے ہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ان کی جو زبان غزلوں میں ہے، وہی مثنویوں اور قصیدوں میں بھی۔

قصیدوں، رباعیوں، مرثیوں اور واسوخت وغیرہ میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ اور یوں تو ایک مشاق استاد کی شمشیر طبع کا جوہر کسی میدان میں بھی اپنی چمک دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ راسخ مرحوم کی چودہ مثنویاں مطبوعہ دیوان میں ہیں لیکن آورد سے تمام مثنویاں مبرا اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک موج زن دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے کلام تمام تر پاک ہے اور زبان و زور بیان قابل داد۔ چند

مثنویاں ضرور شاکعی گئی تھیں۔ لیکن اکثر مثنویوں میں عشق کی داستانیں نظم کی گئی ہیں۔ مثنوی "نورالانظار" البتہ ایک اخلاقی مثنوی ہے۔ لیکن ان تمام مثنویوں میں مثنوی "نازونیاز" ہر اعتبار سے بہترین مثنوی ہے اور شاید اردو ادب میں آپ اپنی جواب۔ اشعار خود بول اٹھیں گے۔:

مثنویوں میں سے چند اشعار مختلف مقامات سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک ہی موقلم ہے لیکن گوناگون رنگ آمیزیوں کی جداگانہ حیرت انگیز تصویریں کہ دیکھنے والا محو حیرت ہو جائے اور پڑھنے والا پڑھے اور جھومے:۔

(مثنوی حسن و عشق):۔

وہ قابل مدحت و ثنا ہو	جو فرط ظہور سے چھپا ہے
شائستۂ احمد ذات اس کی	مظہر ہے یہ کائنات اس کی
ہر فرد کو اس سے فی الحقیقت	ہے معنی و لفظ کی سی نسبت
مستجمع ہر کمال ہے وہ	بے مثل ہے لا یزال ہے وہ
رنگین یہ مرقع پر اشکال	یہ آئینۂ عجیب تمثال
یہ صفحۂ گونہ گونہ تصویر	یہ نازکی قلم، یہ تحریر
یہ کارگہ عجیب و دل کش	یہ خانۂ (نقش) جہت منقش
جانے ہے جسے زعقل آرا	برہان وجود نقش بردار

ہے صنع دلیلِ بودِ صانع صنعت نہ ہو بے وجودِ صانع

جان تن میں ہے آرمیدہ اس سے روشن ہے چراغ دیدہ اس سے
ہے مردم دیدہ حیرت افزا دانا کو ہے اک تحیّر اس جا
یہ صنع بہت ہے فہم سے دور ظلمت کو ہے قابلیتِ نور
ہو مانہ نور کا سیاہی اللہ رِی حکمتِ الٰہی

احمد شہِ انبیائے مرسل دریائے قدم کی موج اول
... ...
ہے مرتبہ اس کا فوقِ ادراک جانوں کا خلاصہ وہ تنِ پاک

وصفِ سخن :-

ہر ہرزہ شہرہ جہان ہو سلطانِ سخن اگر نہ یاں ہو
ہووے نہ سخن تو ہووے ابتر دفتر یہ ظہور کا سراسر
رشتے سے سخن ہی کے ہے محکم شیرازۂ نسخۂ دو عالم
روحِ تنِ انس و جان سخن ہے معشوقِ مزاجداں سخن ہے
یہ بادہ ہے ہم طبیعتِ روح کیفیت اس کی قوتِ روح
گر دیکھئے تک بہ تیز ہوشی تو آدمِ مردہ کی خموشی

کہتی ہے یہی کہ جانِ سخن ہے
تسکین دہ عاشقانِ خستہ
گر ہو نہ سخن تو پیش دلدار
عاشق کرے حال کیونکر اظہار
عشاق کی صورتِ تمنّا
بالکل ہے اس آئینہ میں پیدا

شکوۂ فلکِ جفا شعار

پہونچی ہے کارد استخواں تک
بے مہر ہے آسماں کہاں تک
جینا دشوار ہو گیا ہے
میرا تو چھری تلے گلا ہے

... ...

یعنی مجھ سے اس کے کیا ہے باقی
اک تارِ نفس رہا ہے باقی
سو بھی آمادۂ گسستن
یہ چرخ ہے میرے جی کا دشمن

... ...

کیا کیجئے خمیدہ آسماں کو
گر ہاتھ چلے تو اس کماں کو
یاں تک کھینچوں کہ ٹوٹ جائے
کب تک صدمے کوئی اٹھائے

"توحید واحدے کہ نقش ... ہر بالو داست در وجودش اصل ہر موجود"

ای دیدہ و دل کو عشق آموز
آبِ رخ کار و آتش افروز
نے عجز و نیاز عشق بازاں
نے ناز و غرور بے نیازاں
تو نے تپ عشق دی دلوں میں
سلگائی آگ ان آبلوں میں

آنکھوں کو بنایا جد دل آب — تا ہووے نہالِ عشق سیراب

عالم کی تمام بزم زیبا — مظہر ہے یہ تیری چشم زیبا

جویاں محبوبِ خوش ادا ہر — آئینہ ترے جمال کا ہے

ساتھ اپنے ہی تجکو عشق بازی — پردہ ہے یہ دلبر مجازی

معشوق و وجود عاشقاں ہیچ — محمود و ایاز در میاں ہیچ

جلوے ترے آویں کب بیاں میں — تو پردۂ چشم دلبراں میں

کس کس صورت سے جلوہ گر ہے — حیران ہیں وے جنھیں نظر ہے

وصفِ عشق :۔

کیفیت ادلیں ہے تو ہی — وجدانِ دلِ حزیں ہے تو ہی

... ...

جادو ترا مایہ بخشِ اعجاز — تجھ سا نہیں کوئی شعبدہ باز

... ...

تو چاہے تو لے نیازِ عاشق — کھینچے معشوق نازِ عاشق

خ تو چاہے تو [illegible] ہووے دریا — تو چاہے تو شہر ہووے صحرا

م تو شعبدہ بازی پر گر آوے — تنکے کو پہاڑ کر دکھاوے

پانی میں بھی آگ تو لگاوے — گرمی تری دشت کو جلاوے

تو عقل کے ہوش کھو سکے ہے — جو چاہے سو تجھ سے ہو سکے ہے

... ...

تو وہم و خیال سے پرے ہے　　تو قال و مقال سے پرے ہے
موہوم نہ تو نہ تو مخیلی　　ادل سے پرے ہے تیرا دل
محرم ترے برملا کہیں ہیں　　تیرے ہی تئیں خدا کہیں ہیں

...　...　...　...

عشقِ خود کام سے تخاطب اور خاتمۂ مثنوی :-

مربوط ہے عقل مجھ سے اے عشق　　امداد طلب ہوں تجھ سے اے عشق
اے دافعِ جملہ علتِ روح　　اے مضعفِ جسم و قوتِ روح
کب تک رہوں رفتۂ ہوا کا　　جو یا لذاتِ بے بقا کا
کب تک پابندیٔ علائق　　کبتک رہوں این و آں کا شائق
تو چاہے تو میں فراغ پاؤں　　سب بند سے یعنی چھوٹ جاؤں
کب تک مجھے ہوش یوں ستاوے　　تو چاہے تو زندگی سی آوے
سب کچھ تا بھول جائے مجھ کو　　اک تیرا ہی ذکر رہ جائے مجھکو
تیری ہی کہا کروں کہانی　　اے وجہ بقائے زندگانی

آئیے! مثنوی "ناز و نیاز" کے چند اشعار سے مجھ
پُر کیف ہو کر مستانہ وار آگے قدم بڑھائیں اور اس دیرینہ
سال ساقی کے قدح کی خیر منائیں:-

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے　　کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے
جی ہوا ضعف کی منزل اس سے　　ناتوانی ہے قوی دل اس سے

اس کے دل ہائے شکستہ ہیں کباب
ہے یہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی شراب

عشق کو ساز ہے غمناکی سے
عہد پیوند جگر چاکی سے

پنجۂ غم کے نچوڑے ہوئے دل
ہیں اس آفت کے مقام و منزل

عاشقی مایۂ ناکامی ہے
وجہ رسوائی و بدنامی ہے

یار اس کے سبھی سودائی ہیں
ساکنِ کوچۂ رسوائی ہیں

عشق کا مرتبہ ہے بسکہ بسیط
کب قیاس و خرد اس پہ ہوں محیط

کچھ عجب شعلۂ سرکش ہے یہ
ایک پرکالۂ آتش ہے یہ

گرمیاں اس کی گھلا دیتی ہیں
سنگ کو موم بنا دیتی ہیں

آنکھیں اس عشق میں بھر آتی ہیں
صورتیں اس سے بگڑ جاتی ہیں

ہوش کا خانہ برانداز ہے یہ
سحر پرداز و فسوں ساز ہے یہ

موت ہم قدرِ حیات اس کے سبب
زہر محسودِ نبات اس کے سبب

گرچہ ہے جسم کا وجہ تخریب
علتِ روح کا ہے عشق طبیب

کنتُ کنزاً ہے عبارت اس سے
میں کہوں اس کی حقیقت کس سے

لاگ والے ہی اسے جانتے ہیں
وہی کچھ جانتے پہچانتے ہیں

بے زباں محرمِ اسرار اس کے
سب سے آزاد گرفتار اس کے

عشق میں جیتے وہی جو ہارے
عشق اٹھاوے ہے تعین سارے

عشق طالب بھی ہے مطلوب بھی ہے
یہ محب ہے یہی محبوب بھی ہے

...   ...

عاشقی شوق ہے کچھ مت پوچھو
ہمگی ذوق ہے کچھ مت پوچھو

عشق اک لذتِ روحانی ہے — عشق کیفیت وجدانی ہے

عشق کی چال کرے ہے پامالی — ہے ہمیں وہم سے یہ تازہ خیال

تم روش آہ نہ پوچھو اس کی — جانے دو راہ نہ پوچھو اس کی

راسخ کو فطرت کی طرف سے شاعرانہ طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ جب کوئی غیر معمولی کیفیت رونما ہوتی یا ان کے جذبات کو ٹھیس لگتی تو ان کی شاعرانہ طبیعت میں ایک تموج پیدا ہوتا اور وہ ایک بڑھتے ہوئے دریا کی طرح شعروں کی صورت میں موج خیز نظر آتا۔ ان کی شاعرانہ تخیل اور ان کے وسیع و عالمگیر شاعرانہ جذبات، صرف محبت اور عشق ہی کی دنیا تک محدود نہ تھے۔ بلکہ فلسفۂ و معرفت کے عمیق سمندروں کو بھی اپنے دامن میں لئے تھے۔ لفظوں کے انتخاب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ غیر فصیح، بھدّے اور ایسے الفاظ جو سماعت پر بار ہوں، آپ ان کے نظم کرنے سے احتیاط کرتے تھے۔ غیر مہذب اور کریہہ الفاظ سے آپ کا کلام سراسر پاک ہے کلیاتِ میر میں اکثر جگہ فحش اور متبذل اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ اور کلیاتِ میر رطب و یابس کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے جس میں استادانہ ہمواری نہیں پائی جاتی، لیکن راسخ کا کلام ابتذال و رطب و یابس سے بالکل معرّا ہے۔ اور یہ شرف شاید درد اور راسخ ہی کے لئے مخصوص تھا۔

ہندی الفاظ راسخ اپنے شعروں میں اس خوبی سے نظم فرماتے تھے کہ کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا تھا۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

لاگو اس کے متصبر پائے   وے گئے گذرے ادھر جو آئے
لاگ سے اس کے بروگی ہوئے لوگ   جوگ لینے گئے جوگی ہوئے لوگ

اب تو ویراں ہے یہ گلی اس بن :   سعت ہرجی کو بھکلی اس بن

کی درست اس شہید عشق کی گور   گئے روتے سب اپنے گھر کی اور

راسخ کی زبان ایسی صاف، شستہ، آسان اور دل کش ہے کہ بول چال معلوم ہوتی ہے۔ کلام میں ایسی روانی ہے کہ نظم اور نثر میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

جسم وہ جانِ جاں نہیں رکھتا   نام ہے پر نشاں نہیں رکھتا

کس حسرت سے جی دیا ہو گا   کیا ہوا ہو گا کیا ہوا ہو گا :

وہ حزینی وہ اس کی سمنومی :   ہائے محرومی ! ہائے محرومی !

جینا دشوار ہو گیا ہے   میرا تو چھری تلے گلا ہے

اِس ضمن میں ایک غزل بھی پیش کی جاتی ہے۔ ملاحظہ میں آئے:-

جو بندہ کہ رحمت کا سزاوار نہیں ہے ‌ اس کا یہ گنہ ہے کہ گنہگار نہیں ہے
مت ہم کو ڈرا اس سے گذر جائیگا زاہد ‌ دن حشر کا فرقت کی شبِ تار نہیں ہے
کس طرح یقین آئے مجھے آنیکا تیرے ‌ اک بار اگر ہاں ہے تو سو بار نہیں ہے
ہوں شعلۂ تصویر و چراغِ شبِ مہتاب ‌ جلنے سے مرے کوئی خبردار نہیں ہے
اے شیخِ حرم معرکۂ پندار میں تیرے ‌ ہے کون سا وہ تار کہ زنار نہیں ہے
تھی دید کی رخصت تو نہ تھی طاقتِ دیدار ‌ طاقت ہے تو اب رخصتِ دیدار نہیں ہے
ہے پست و بلند اسمیں بہت دیکھیو راسخ ‌ رہِ عشق کے ویرانے کی ہموار نہیں ہے

راسخ مرحوم نے کسی کی ہجو سے اپنے دامنِ شاعری پہ کبھی دھبہ نہیں آنے دیا۔ راسخ نے دنیا کو چشمِ حقیقت بیں سے اُس کے اصلی رنگ میں دیکھا اور کبھی اس کی ظاہری آرائش کے گردیدہ نہ ہوئے۔ مادی دنیا کو کبھی روحانی دنیا پر ترجیح نہ دی اور ہمیشہ اپنی دماغی اور ذہنی دنیا کے کیف آگیں و لطف پرور سرور سے مست رہے۔ بعید از قیاس تشبیہوں اور استعاروں سے حتی الوسع احتراز کرتے رہے۔ راسخ نے صرف عربی و فارسی قصوں اور افسانوں کو پیش نظر نہیں رکھا۔ بلکہ ہندستان کی عشق و محبت کی داستانوں کو بھی یاد دلایا ہے مثنوی حسن و عشق میں فرماتے ہیں:-

آرام وطن و تن سے چھوٹا ‌ تل تیرے سبب وطن سے چھوٹا

جوگی بنا کا مروپ آخر کھو بیٹھا وہ رنگ روپ آخر
دریا دریا رلایا اس کو صحرا صحرا پھرایا اس کو
خواب ایک ایسا اسے دکھایا جس خواب نے فتنے کو جگایا

راسخ کے ہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن سے اس وقت کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ننگ ہیں وہ جو حقیقت میں صف پائیں گے
بزم میں صدر نشیں ہوتے ہیں جا کر اکثر

کہاں وہ عہد اب تو زور بازارِ سفیہان ہے
رئیس ایسے بہت کمیاب ہیں جو ہوں ندون پرور

کیا عہد ہے کہ سچے کو احمق کہے ہے خلق دانا وہی ہے اب جو کہے سر بسر دروغ

ڈھونڈتا ای یار زیار باوفا اس عہد میں یار لاکھوں پر وفا نایاب تر عنقا سے ہے

نصیحت آموز اور سبق آموز اشعار بھی آپ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی شعر بھی زبان کی دل آویزی اور حسنِ بیان کی دل کشی سے خالی نہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

اس کارواں سرا میں تو ہے کوچ ہی کا شور — عبرت کا یہ مقام ہے کیا کوئی یاں رہے

وہ سعی کر کہ تجکو حاصل ہو دولت ِدیں — منعم متاع دنیا کتنی ہے؟ کسقدر ہے؟

چمن دہر کی رنگینی کا عاشق مت ہو — عقل رکھتا ہے تو دل دے چمن آرام کے نئیں

اس باغ میں جوں نکہت گل رہ تو سبکبار — تا یاں سے جو چلنا ہو تو دشوار نہ ہووے
کوتاہ نہ کیجیو راہِ طلب یار — ہاں دیکھیو پامال کوئی خار نہ ہووے

راسخ نے صنائع و بدائع کا استعمال اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ نہیں معلوم ہوتا کہ بالقصد رعائت لفظی کا کوئی التزام کیا گیا ہے ۔ ایک ہی مرقع میں آورد اور آمد کی عدیم المثال رنگ آمیزی ملاحظہ ہو :-

کبھی اشکِ گلگوں کا ٹوٹے نہ تار — رہیں دامن و جیب باغ و بہار

ترے ہاتھوں ارباب دیں خوار ہیں — ترے ہاتھوں تسبیحیں زنار ہیں

سو عشق کے سبب سے بیگانہ وہ — چراغ محبت کا پروانہ وہ

وہ آزاد مردِ خردمند تھا ۔ کہ دامِ محبت کا پابند تھا

ہوا جوں ہی اس مہروش سے دوچار ۔ زمیں پر نہیں گر پڑا سایہ دار

مرے جی کو محویت اک ہو گئی ۔ مجھے آج بھی آ کے تو کھو گئی

روشن اس سے ہر جان کا کاشانہ ۔ ہے تنکا اُسی پہ پروانہ
بلبل آشفتہ ہے سدا اُس کی ۔ ہے گلِ تازہ کو ہوا اُس کی
لالہ بھی اس کا داغ رکھتا ہے ۔ تو اُسی کی چراغ رکھتا ہے
کہ وہ محبوب مایۂ خوبی ۔ چاہ میں ڈوبی چاہ میں ڈوبی

سہل راسخ مت سمجھو غواصیِ دریائے عشق ۔ اس کی تہ داری سے زہرہ آب ہے پیراک کا

شہادت گاہ خونریزِ محبت طرفہ جا دیکھی ۔ کہ جو مقتول تھا یاں خنجرِ قاتل کا ممنون تھا

عشق میں ہے آبرو اس دیدۂ تر سے مجھے ۔ ہے عزیز آنسو کا اک اک قطرہ گوہر سے مجھے
لٹے بالوں کا ترے سودا درازی کو بھی ۔ سر برہنہ لے گیا بازار تک گھر سے مجھے

راسخ فارسی ترکیبوں کو کس حسن کے ساتھ نظم فرماتے ہیں۔

اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

رشتے سے سخن ہی کے ہے محکم ‏ ‏ ‏ ‏ شیرازۂ نسخۂ دو عالم

صیادِ دلِ فرشتگان، ناز ‏ ‏ ‏ ‏ خواہندۂ جاں، اداؤ انداز

عجب کچھ ہے مجھ کشتۂ غم کا حال ‏ ‏ ‏ ‏ نہ تابِ جدائی نہ تابِ وصال

گلِ داغ جگر نگاران ہے ‏ ‏ ‏ ‏ خانہ ویران کن ہزاراں ہے

پیشِ چشم اس کے جو کہ بینا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ عالم اک نو عروسِ زیبا ہے

آنکھ والے کی ہے نظر میں فاش ‏ ‏ ‏ ‏ حُسنِ تحریرِ خامۂ نقاش

راسخ کے ہاں فارسی محاوروں کے ترجمے بھی نہایت ہی خوبی کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

تماشائی سب دیکھ حیراں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ سب انگشتِ حیرت بدنداں رہے

الٰہی مجھے ہے سرِ معرفت ‏ ‏ ‏ ‏ رخ دل پہ وا کر درِ معرفت

جان تن میں ہر آمیدہ اس سے　　روشن ہی چراغ دیدہ اس سے

پہونچی ہی کاردم استخواں تک　　بے مہر ہر آسمان کہاں تک

اردو کے مشہور محاوروں اور زبان زد مثالوں سے راسخ کا کلام بھرا پڑا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

شور برپا زبس کیا اُن نے　　کوچہ سر پہ اٹھا لیا اُن نے

رہی یاں تیری آئینے پہ نگاہ　　خاک میں مل گیا اُدھر وہ آہ

اب بھی اس سے جدا رہوں گر میں　　منہ دکھاؤں وفا کو کیونکر میں

ہنگامہ ہی دل میں کلفتوں کا　　بازار لگا ہی حسرتوں کا

تو شعبدہ بازی پہ گر آوے　　تنکے کو پہاڑ کر دکھا دے

بیاں کیا کروں اس کے خو کی لاگ　　کہے تو کہ لاگی ہی پانی میں آگ

میر کی طرح سوز و گداز ان کی غزلوں کی بھی جان ہی اور وہی

رونا، رلانا ان کی غزل گوئی کا بھی طرۂ امتیاز۔ اب راسخ کے اس رنگ کے متعلق بھی جس نے راسخ کو راسخ اور فخر میر بنایا چند جملے سن لیجئے۔ طبیعت میں گداز، کلام میں درد بیان میں برشتگی، شعروں میں رنگ آشفتگی! اس کا سبب؟ اس کی وجہ؟ وہی محبت، وہی عشق! جب تک دل پر چوٹ نہیں لگتی، آنکھیں پرنم نہیں ہوتیں۔ جب تک خانۂ دل میں محبت کی آگ نہیں بھڑکتی، تب تک آہوں کا دھواں نہیں آتا۔ جب تک کسی سے آنکھیں نہیں لڑتیں، دل میں گداز نہیں پیدا ہوتا۔ کسی کے تیر نظر کے راسخ بھی شکار رہے لیکن صید در دام ابتلا پابستہ، مرغ بازو شکستہ۔ خود فرماتے ہیں۔ ؎

میں وہ طائر ہوں جو پربستہ ہو
مضطرب الحال، جگر خستہ ہو

مثنوی گنجینۂ حسن میں خود ان ہی کے موقلم سے ان کے عشق کی مرقع کشی اور اس کی رنگین تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

اس گل کی ہوا ہے دل میں اپنے
یہی آتش ہے آب گل میں اپنے

کوئی محبوب اور ایسا کہاں ہو
سرو سرخیل خوبانِ جہاں ہو

یہ ذرے میں وہ خورشیدِ درخشاں
تنِ جاں کی ہو جاں وہ مایۂ جاں

یہ کانٹے ہیں گلِ سیراب ہو وہ
نہ ہو مہ، مہر عالم تاب ہو وہ

گلِ ہر گلستاں شرمندہ اس سے
نزاکت یہ کہ جاں شرمندہ اس سے

بہت ہو کم نگاہ و کم سخن وہ
حجاب آلودہ تمکیں حملہ تن وہ

یہ کم کم دیکھنا بھی اک ادا ہے
حجاب آمیز شوخی، خوش نما ہے

رہے ہے شرم کے پردے میں محجوب
ہر اس کی بے حجابی کتنی محبوب

سراپا اس کا دلچسپ اس قدر ہے
کہ ہر جو عضو، وہ دام نظر ہے

سنتے آتے ہیں کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے اور یہی آگ جب سلگتے سلگتے بھڑک اٹھتی ہے اور خرمن دل کو جلا کر تو وہ یاس و ناکامی بنا دیتی ہے۔ تو یہی سوز، راہِ عشق حقیقی کا رہنما بن کر اُسے منزل سکون و عالم عیش نشاں میں پہونچا دیتا ہے۔ زنجیر علائق کی تمام مجازی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس جادہ پیمائے منزلِ حقیقت کے پاؤں سے الگ ہو جاتی ہیں اور وہ اس عالم میں پہنچ جاتا ہے، جس کی خبر نہ مجھ کو ہے اور نہ آپ کو۔ راسخ کا عشق مجازی بھی ان کا رُخ اس طرف سے اس طرف پھیر دیتا ہے۔ اور آخر خود کہہ اٹھتے ہیں :-

الٰہی دے وہ آتش دل کے اندر
کہ جس سے شعلۂ دوزخ رہے تر

جگر وہ جس میں ہووے داغ پر داغ
ہزار آتش کدے ہوں زیر ہر داغ

رہے سوزش سے سینہ رشکِ گلخن
نفس آتش پہ دل کے مارے دامن

دھواں آہوں کا پہونچے آسماں تک
محبت آتش افگن ہو یہاں تک

مزے سے درد کے جو آشنا ہو
الٰہی اب مجھے وہ دل عطا ہو

نہ تا پیرہن زنہار بچادیں
مجھے بس آنسوؤں کے تار بچادیں
رہیں رسوائیاں ہنگامہ آرا
رہے گلیوں میں مجھ سے حشر برپا
سدا ہیں اور صحرائے محبت
رہوں سرمستِ صہبائے محبت

راسخ مرحوم نے اپنے اکثر اشعار میں فلسفیانہ مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور مشکل سے مشکل مسئلے کو ایسی آسان اور سلیس زبان میں نظم کیا ہے کہ ایک ذی فہم دادِ سخن دیئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کہیں تخلیقِ عالم کی غرض بیان کرتے ہیں۔ کسی جگہ لکھ جاتے ہیں کہ عالم خود خدا کے وجود کا روشن آئینہ اور اس کی ہستی کی نمایاں دلیل ہے۔ کسی شعر میں یہ کہہ جاتے ہیں کہ دنیا بظاہر دیکھنے میں بڑی ہی دل کش اور نظر نواز ہے۔ لیکن فانی اور ناپائدار۔ تمثیلاً چند شعر قلم بند کئے جاتے ہیں:۔

عرض کرنا تھا ہنوز اس کو اپنی شان کا
اس لئے وضع ہوا آئینہ اعیان کا

کوئی بانی ہے بے شک محفلِ زیبائے عالم کا
نہ ہو یوں منتظم مجلس نہ جب تک مجلس آرا ہو

کوئی در پردہ کار فرما ہے   ڈھب سے اس کارگہ کے پیدا ہے

معنی کے تئیں ہم نے تو صورت ہی میں پایا
نقاش ہمیں نقش کے اندر نظر آیا

شمع سحر ہیں ہم تم کیا بود و باش یاں کی
روشن ہے بے بقائی اس مجلس رواں کی

دامانِ دل اس باغ کا اسلوب کشاں ہے
یاں پردۂ ہر رنگ میں اک دام نہاں ہے

المختصر راسخ کا کلام بھی شاعری کی جان ہے۔ الفاظ کی ترتیب موزوں، بندش دل کش، ہر مصرع ترنم ریز اور موسیقیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا سامعہ نوازی کا ضامن، اخلاق و تصوف کے نصیحت آمیز اور عرفاں مآب اشعار سرور و کیف بخشِ دل و دماغ۔ طوالت کی معذرت چاہتا ہوا اب چند ایسے شعروں کے پیش کرنے کے بعد جو ان کی بوقلموں طبع کے آئینہ دار ہیں، یہ طویل مگر دل چسپ داستان ختم کرتا ہوں:۔

ہوئے سب منتفع تقسیم قسام ازل سے پر
وہ جائے رشک ہے جس نے دل درد آشنا پایا

نہ بھا دیں گے ہمارے بعد اُسے دلہائے بے نسبت
ہمیں اک عمر روئے گا مزا دل کی اسیری کا

جوانی ہنس کے کاٹی اب پلک پر اشک چمکے ہیں
جو رات آخر ہوئی نکلا ستارا صبحِ پیری کا

مرا سینہ ای محبت جو بنے تو باغ کرنا یہ اسی لئے بنا ہے اسے داغ داغ کرنا

مجکو دیوانہ بنا گلیوں میں پھروانا نہ تھا
پردہ کرنا تھا تو پہلے جلوہ دکھلانا نہ تھا

عجب اک معنوی پیوند ہے دل سے محبت کو
اسے بھاتا ہے دل ٹوٹا ہوا اند نگینوں کا

تمہارے التفاتِ خاص ہی وجہ جنوں یاں
تماشا ہم نہ بنتے گر تماشائی نہ ہوتے تم

طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں ::
کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں ::

ارائشِ زلف اپنی کیا ہم کو دکھلاتے ہو — کیوں ہائے دِوانے کی زنجیر ہلاتے ہو

آہ مر کر بھی فراغ اس سے بہ دشواری ہے — دل کا الجھاؤ بھی اک سخت گرفتاری ہے؟

ہے سایۂ مژہ میں واں وہ نگاہ بانکی — یاں پارۂ جگر کے کیا جانے کہ کیا ہے
نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو انھوں پہ ہے
جنھیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

دل سے تو اٹھے شعلے جاں سے — چنگاری یہ آ پڑی کہاں سے

قرب ابرو کا اس چشم سے میں دیکھ ڈرتا ہوں
پاس لیٹے سیہ مست کے تلوار دھری ہے

اگر باب اجابت تک رسا ہوتی دعا اپنی
تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے

بہت سی باتیں دنیا میں رسماً رواج پا گئی ہیں لیکن ذیل کی یہ چند سطریں رسم و رواج زمانہ کی نہیں، بلکہ میرے دلی جذبۂ تشکر و امتنان کی ترجمان ہیں۔ سب سے پہلے میں اپنے مخلص کرم فرما پروفیسر سید اختر احمد صاحب اختر اورینوی کا شکر گذار ہوں۔ کہ آپ نے میری استدعا پر ایک مفید اور پُر مغز "حرف آغاز" لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ آپ نے بہت سے پوشیدہ خط و خال کو نمایاں کیا ہے۔ اور بہت سی ایسی ضروری باتیں بھی لکھی ہیں۔ جن کی طرف واقعی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اِس سلسلے میں اپنے چند عزیز شاگردوں کا بھی شکریہ ادا کر دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ جن میں سے بعض نے "حرف آغاز" لکھوا کر لانے میں سعی فرمائی۔ اور بعض نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور مسودے کے صاف کرنے میں میری مدد کی ہے۔ محمد علی خاں بی، اے، سید شاہ حافظ وسیم الحق طرب عمادی مجیبی، محمد احمد تبسم اور محمد مسلم شمیم میری پُرخلوص دعاؤں کے مستحق ہیں۔ میں اراکین انجمن نو بہار ادب، کا بھی تہِ دل سے منت گزار ہوں۔

انتخاب راسخ اور اس کا دیباچہ ۱۹۳۶ء میں مرتب ہو چکا تھا اور اس میں میرے محترم بزرگ (ڈاکٹر) سید عظیم الدین احمد عظیم مرحوم مغفور کے اصرار کو بہت کچھ دخل تھا۔ لیکن اُن کی

زندگی میں یہ انتخاب شائع نہ ہو سکا۔ آپ نے اس انتخاب کا جو تعارف، لکھا تھا وہ "معاصر" پٹنہ میں شائع ہو چکا ہے۔ میں جیسا ابتداء میں عرض کر چکا ہوں کہ عظیم آباد کا ادبی ذوق ہمیشہ مایوس کن رہا ہے۔ اور یہی چیز اس انتخاب کے شائع کرنے میں اس وقت تک مانع رہی لیکن اس طرف انجمن نوبہار ادب پٹنہ سیٹی کے بعض اراکین کے اصرار پر میں نے اپنے قدیم مسودے پر نظر ثانی کی اور اپنے دوست پروفیسر اختر صاحب کو بھی تکلیف دی کہ وہ چند سطریں بہ طور "پیش لفظ" لکھ کر مجھے بھیج دیں۔ اراکین انجمن سے زیادہ اختر صاحب کے ہمت افزا الفاظ اور ان کی قدر شناسی اس کی محرک ہوئی کہ یہ چیز بُری یا بھلی جیسی بھی ہے، آپ کے سامنے پیش کر دی جائے۔ یہ کتاب زیادہ تر طلبائے کالج کے خیال سے لکھی گئی ہے۔ خدا کرے ان کے لئے مفید ثابت ہو۔ ورنہ یہاں کے ارباب ذوق کی قدر دانی تو معلوم:

حافظ زتابِ فکرتِ بے حاصلی بسوخت
ساقی کجاست تا زند آبے بر آتشم

حمید منزل۔ لودی کٹرہ
پٹنہ سیٹی
۱۵ر مئی ۱۹۵۰ء

ہیچمداں
حمید عفی عنہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہے جانِ آفریں جس نے جہانِ جاں کیا پیدا ‏ کفِ خاکِ سیہ سے صورتِ انساں کیا پیدا

رخِ زیبا دیا گل کو، دلِ بے صبر بلبل کو ‏ اسے خنداں کیا پیدا، اسے گریاں کیا پیدا

ہے اس کی جستجو واجب سبھوں پر جس نے اے تسنیم ‏ بایں خوبی و درد لق عالمِ امکاں کیا پیدا

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا ‏ دید کیا اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا

دل سے آگے کیوں بڑھا تو اے طلبگارِ وصال ‏ پھر اُدھر ہی جا وہی گھر جلوہ گاہِ یار تھا

کفر بھی اک شان جلوے کی اُسی دلبر کے ہے ‏ شیخ کیوں تو برہمن سے برسرِ پیکار تھا

مظہرِ انوارِ گوناگوں رہا ہر آن دل ‏ کس قدر محوِ تجلی ہائے بے تکرار تھا

کب وہ ینہ خواہ ایثار آخر اپنے قاتل سے ہوا ‏ وہ تو دستِ و تیغِ قاتل ہی کا خریدار تھا

عرض کرنا تھا ہمیں اس کو اپنی شان کا ‏ اس لئے واضح ہوا آئینۂ اعیان کا

دل کو جمعیت ہوئی جوں جوں پریشانی ہوئی ‏ کیا ہمارے کام آیا تفرقہ سامان کا

گرداں ہے جو طالب اس کا ہے کوئی پھیرنے والا ‏ طالب ہے وہی جس نے اسے ڈھونڈھ نکالا

دیوانہ انہیں جانے ہے نافہمی سے ہر ایک ‏ وارفتوں کا تیرے ہے چلن سب سے نرالا

بیدردی سے طے کیجیو نہ راہِ طلبِ یار ‏ ہاں ٹوٹنے پائے نہ کوئی پاؤں کا چھالا

یہ کیا نسبت ہے جس سے سنگ کو آہن ربا پایا ‏ فلاطوں نے بھی اپنا فہم اس جا نارسا پایا

تمہارے آشنا کب خلق سے رکھتے ہیں آمیزش ‏ انہیں تو آپ سے بھی ہم نے بیگانہ سدا پایا

دلِ بلبل نہ تنہا چاک ہے اس عشق کے ہاتھوں ‏ یہ وہ ہے جس سے گل کے بھی گریباں کو قبا پایا

ہوئے سب منتفع تقسیمِ قسامِ ازل سے پر ‏ وہ جائے رشک ہے جس نے دلِ درد آشنا پایا

یہ دل ہائے خنک جا گہہ کہاں ہیں داغ کی تیرے   اسے جلتے ہوئے سینوں ہی میں ہم نے لگا پایا

وہ بت آیا جو ان کے پاس ایسا خوش ہوئے شیخ   انہوں نے آپ کو یوں گم کیا گویا خدا پایا

عجب اک معنوی پیوند ہے دل سے محبت کو   اسے بھاتا ہے دل ٹوٹا ہوا اندوہگینوں کا

جس آتش خو کو ہوا اپنی ہی خوبی پر نظر ہر دم   نہ دیکھے حال کیونکر آہ خاکستر نشینوں کا

بہت پونچھے ہیں پلکان اشکِ خونیں سے نہ چھپا اب   رنگ کھائے تہ ہر تار اپنی آستینوں کا

اس باغ میں ہوں میں شجرِ صفحۂ تصویر   کیا پوچھو ہو احوال مری نشو و نما کا

نہ ہرگز ہو سکا ای انقلابِ آسماں تجھ سے   طرف ہم غمزدوں کے پھیرنا اسکی طبیعت کا

ہزاروں غنچۂ پیکانِ تیر اس میں نمایاں ہیں   ہوا ہے باغ ہر کوچہ مرے دل کی جراحت کا

ہمارے رونے سے دریائے رحمت جوش میں آیا   رہا ہر آن ہر ساعت ہجوم اشکِ ندامت کا

مجاز آئینہ دارِ حسنِ محبوبِ حقیقی ہے   وہ بے معنی ہے جسکے تئیں نہ ہو شوقِ اچھی صورت کا

عبارت ہے فراقِ دوست دل کی بے حضوری سے   وصالِ دوست کیا ہے درمیاں سے اٹھنا غفلت کا

بالطبع دل طرب سے ہمارا نفور تھا   اپنا تو غم ہی مایۂ عیش و سرور تھا

ہر چند ہزار آئینوں میں جلوہ گر ہوا   اس خوش نما کو میرے یہ شوقِ ظہور تھا

یوں موردِ جفا اِسی تقصیر پہ ہوئے   اہلِ وفا تھے ہم یہ ہمارا قصور تھا

تجویز داغ دل کے لئے بے سبب نہ تھی   اِس عضو کا جلانا ہی شاید ضرور تھا

پہلے مجھی کو لے گئی ساقی کی چشم مست   باآنکہ مجکو سب سے زیادہ شعور تھا

عکسِ خواہش کی تمنا تھی وہ ہو نہ سکا   پہلے مرنے کے جو مرتے تو یہ دشوار نہ تھا

بیچ میں الفتِ صیاد کے ہم آہ رہے   قفس و دام کا دل اپنا گرفتار نہ تھا

شوقِ دیدار نے کی روکشی مدتِ حشر   صبر کا ورنہ یہ اندازہ و مقدار نہ تھا

شکر ہے یہ کہ ہوئی جنسِ نیاز اپنی قبول
ورنہ ناز اُن کا تو اس کا بھی خریدار نہ تھا

تھی انھیں وسعتِ رحمت کی نمائش منظور
قابلِ عفو وگرنہ یہ گنہگار نہ تھا

زندگی کرنے کا ہم ڈھنگ ہی بھولے تم بن
ورنہ یہ مہلتِ کم کاٹنا دشوار نہ تھا

خط و خالِ رخِ دلدار کی زیبائش کا
علم تھا جس کو وہ محوِ رخِ دلدار نہ تھا

کاش یوں تیرہ نہ یہ آئینۂ دل ہوتا
صاف ہوتا تو رخِ یار کے قابل ہوتا

کامل اپنے تئیں جانا رہا ناقص زاہد
نقص پر اپنے نظر ہوتی تو کامل ہوتا

تم سے کچھ بندے نے چاہا تو تمھیں کو چاہا
اور کیا مانگتا کس چیز کا سائل ہوتا

کوشش ایسی کر کہ وا ہو عقدۂ دشوار دل
کھول اس عقدے کو پھر ہر عقدہ وا ہو جائے گا

حیرتی ہیں اُس نگہ کے گو ہمیں معلوم ہے
پار سینے کے یہ تیرِ بے خطا ہو جائے گا

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہو جائے گی
آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہو جائے گا

دکھ سہے ترک جو تھا رہِ دلدار کیا
آہ یہ ہجر نے دونا ہمیں بیمار کیا

خاکِ ناچیز کہاں اور کہاں استعداد
اس کو تفویضِ امانت کا سزاوار کیا

تم نے راسخ تنِ عریاں پہ جو توڑے ناخن
کیا نمک پاشی کا اس شوخ نے اقرار کیا

اس طریقِ عشق میں درپیش ترکِ سر رہا
راہ سب پا لغز تھی لغزش نہ ہو یہ ڈر رہا۔

آہ جز اشکِ ندامت یاں گرہ میں کچھ نہ تھا
ساتھ اپنے کوچ کے وقت اک یہی گوہر رہا

دی نہ راہب نے جگہ راسخ کو بتخانے میں جب
تب پسِ دیوارِ کعبہ وہ بنا کر گھر رہا۔

مت چشمِ کم سے دیکھو مری چشمِ تر کو ہے
اک ابر اس حباب میں دریا چھپا ہوا

محجوبیِ عیبِ حسن ہے پردے سے نکلو تم
صاحب جمال جو ہوا وہ خود نما ہوا

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ
کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

برسوں رہا ہے صدمہ کش اشک و آہ دل ـ یہ نسخہ ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہوا

تم جو دامن کشاں یہاں سے گئے ـ صبر کا جیب تار تار ہوا
دہ بھی اس کی زلف کی دو ہے ـ جس سے آشفتہ روزگار ہوا
دور میں اس کی مست آنکھوں کے ـ محتسب بھی شراب خوار ہوا
ضبط گریہ تھا فرض عین ولے ـ ق ـ ہم کو اس پہ نہ اختیار ہوا
آنسو نکلے کہ ہو گیا طوفاں ـ تھا جو پردے میں آشکار ہوا

ہے نام اس کا دفتر اہلِ وفا سے محو ـ جور و جفائے یار کا جس نے گلا کیا
اترا نہ اس گلابی کا سر سے نشا کبھو ـ شکر اس کا جس کے یہ دلِ پر خوں عطا کیا

بھٹک مت جو طالب ہے راہ خدا کا ـ تجھی میں تو جلوہ ہے اس خود نما کا
بنا آپ کو خاک تا صاف ہو دل ـ سبب ہے غبار آئینہ کی صفا کا
بہت رو کہ یہ جوشِ اشکِ ندامت ـ ہے کفارہ تیری نمازِ ریا کا
بتدریج اس سے رہا آپ کو کر ـ ترا دام ہے، دامِ حرص و ہوا کا
بری اول آخر سے ہے ذات اس کی ـ نہیں دخل واں ابتدا و انتہا کا

ضو مہ و مہر نور تیرا ـ ہر ذرے میں ہے ظہور تیرا
رہ جملہ قصور ادب یہی ہے ـ ہر چند نہ ہو قصور تیرا
نسبت تو درست کر کسو سے ـ تا دل نہ ہو بے حضور تیرا
غافل تو عیب بیں ہے سب کا ـ یہ عیب ہو کاش دور تیرا

اللہ رے یہ تصرف عشق ـ تم ہو جو وجہ سرور اپنا
تم سے تم کو نہ ہائے مانگیں ـ جنت چاہیں قصور اپنا

مستوری حسن کب تک آخر — بجایا ان کو ظہور اپنا

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا — بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا
تہی دتی سے اپنی خوش ہوں اے محمد — کہیں معمور ہو پیمانہ تیرا
کدھر کعبہ کہاں کا عرش اعظم — دلِ بشکستہ ہے کاشانہ تیرا

تا عمق بحر وحدت وے نہ پہونچیں موج ہوں — ڈوبے ہوئے ہی جائیں احوال اس کی تہ کا
محو دل اس کو دیکھا راسخ کی طرح ہر دم — جس نے نشان پایا جاناں کی جلوہ گہ کا

نہیں ہم پائے بند اعتبارات — نہ کوئی دوست نے دشمن ہمارا
کریں کیونکر نہ شکر دیدۂ تر — کہ گھر سے پنہ رہا دامن ہمارا
یہ آئینہ ہے شایان رخ یار — کہیں ہو جائے دل روشن ہمارا

تماشائی ہم کو غیر از داغ یاں سے کچھ نہیں حاصل — سراسر ہم نے تو یہ گلستاں لالہ ستاں پایا
یہی نام و نشاں سد راہ دلداریں راسخ — کیا طے جس نے اس کو یار کا ان نے نشاں پایا

اس میں ساعی ہو کہ ہو قلب کو نسبت پیدا — گر کسو صاحب نسبت سے ارادت پیدا
نقص عرفان ہے افراط تحیر کا علم — علم حیرت نہ ہو کر ایسی تو حیرت پیدا
متصرف ہو اگر عشق طبائع میں تو پھر — غم سے الفت ہو خوشی سے ہو عداوت پیدا

دل قضا نے جو دیا طرفہ یہ احسان کیا — میرے ہاتھ آئینہ دے کر مجھے حیران کیا
طول سے خواہش دنیا کے رہے ہم درہم — یہ ہوا جوں چلی تند پریشان کیا نہ
بیش و کم زاد سفر پاس ہے سب کے راسخ — ہاں کہو تم نے بھی کچھ کوچ کا سامان کیا

ہووے مسجود ملائک کب یہ رتبہ خاک کا — اس میں اک سر ہے کہ دل خوں کن ہے وہ افلاک کا
سہل راسخ مت سمجھ غواصی دریائے عشق — اس کی تہ داری سے زہرہ آب ہے پیراک کا

دل خوں تھا دیدہ خوں فشاں تھا　　تم بن عجب ایک رنگ یاں تھا
دل سکنِ جاں تو تھا و لیکن　　کوئی جان کے بھی درمیاں تھا
جی کھو کے بھی ہم گر اس کو پاتے　　تو مفت ہمیں وہ جان جاں تھا
جان دی لیکن کیا کار وفا ان نے تمام　　آستانِ یار پر کہتے ہیں راسخ مر رہا
شہادت گاہِ خوں ریز محبت طرفہ جا دیکھی　　کہ جو مقتول تھا یاں خنجر قاتل کا ممنون تھا
مگر راسخ نے تازہ کوئی دل پر چوٹ کھائی　　شب اس کو ہم نے جو دیکھا بہت گریاں و محزوں تھا
پیش ازیں تم تھے جہاں بسبب تسکیں کے　　اس مکاں کے در و دیوار کو دیکھا کرنا
دوستی کاش نہ ہوتی مجھے تم سے اتنی　　ہائے دشمن ہوا یہ رابطہ پیدا کرنا
نہ بھاویں گے ہمارے بعد اسیر دلربا بے نسبت　　ہمیں اک عمر روئے گا مزا دل کی اسیری کا
جوانی ہنس کے کاٹی اب پلک اشک چکر ہر　　جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا
گرانا چاہتا ہے عیب دانش مجکو رتبے سے　　جنوں آ ابھی ہی تو وقت ہے اب دستگیری کا
بگڑی جب سب سے تب کچھ ان سے　　اسلوب بنا موافقت کا
بن بندگی صاحب کو کیا منہ میں دکھاؤنگا　　آزادی سے درگذرا بندہ ہی کہاؤں گا
پردہ رخِ معشوق کا ہے ہستی ہماری　　کیا اپنے تئیں بیچ سے مشکل ہے اٹھانا

قطعہ

ٹھنڈی رکھو چھاتی مری آغاز محبت　　ادل ہے مداوا ہی اس دردِ نہاں کا
کہتے ہیں کہ ہے داغ تو پایان تدابیر　　پہلے ہی جلانا یہ ہے دستور کہاں کا
تھا جی میں کہ دشواری ہجر اس سے کہیں گے　　پر جب ملے کچھ رنج دمن یاد نہ آیا
ہستی نے عدم دل سے بھلا ہی دیا راسخ　　غربت میں رہے یوں کہ وطن یاد نہ آیا

مت جبر کے متحمل رہو ہائے — ہم بے صبروں میں کیا رہیگا

آئینۂ دل کی ہے صفا شرط — یار اپنا منہ دیکھتا رہے گا

ہے باب سجود در تمہارا — سر اپنا یہاں جھکا رہے گا

ان مست آنکھوں کو دیکھ کر شیخ — دیکھیں کہ پارسا رہے گا

ہے آشنا کشی یا دوست مدعا تیرا — وہ دشمن اپنا ہے جو ہووے آشنا تیرا

بیان کی نہیں رخصت یہ کہتے ہیں وے لوگ — جنھوں نے چکھا ہے ای عاشقی مزا تیرا

ناکامی ہو رہی یاں وابستہ کامیابی — چاہت میں پیش ہم کو کار عجیب آیا

لے گئی کہ کر کران تک یوں ناشکیبی دل — کہنے لگے کہ پھر یہ آفت نصیب آیا

غربت ہی کا تعب کش راسخ رہا ہمیشہ — نزہت گہہ وطن تک کب وہ غریب آیا

سونپا ہے داغ اُن کا تازہ ہی بیدار رکھا — ہم نے اس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

معمور طرب رکھا دل دوست نے دشمن کا — آنکھوں کو محبوں کی آنسو سے بھرا رکھا

کیا ہوا واقعہ خوان دلِ غمکش راسخ — جب وہ آتا تھا بہت ہم کو رلا جاتا تھا

کعبہ میں ہو گیا گذر ہمارا — ہے تا دیر دل سفر ہمارا

وے ہنستے ہیں رونے پر ہمارے — کیا گریہ ہے بے اثر ہمارا

لپٹے بالوں نے ان کے آخر — قصہ کیا مختصر ہمارا

کیوں کر ہم ڈھونڈیں نہ ہم کو دل میں — کہتے ہو دل ہے گھر ہمارا

جی جانے ہے لاگ اس پلک کی — برچھی سے بڑھا جگر ہمارا

ہے اس محبوب کا سراپا — راسخ دام نظر ہمارا

دیکھنا ہی نہ تھا منظور تماشا جو تمہیں — تو بھلا پھر ہمیں دیوانہ بنانا کیا تھا

ہے ہنوز اُن کے تئیں مجھ سے کدورت شانہ
خاک پر آ مری دامن کا اُٹھانا کیا تھا

دل تمھیں پیارا ہی تھا راسخؔ دیا اُن کے تئیں
ہائے اس شیشے کو پتھر سے لگانا کیا تھا

دل تیرہ ہے اپنا، خوش وہ، جس نے
یہ آئینہ بے غبار پایا

اوہام میں یاں کے اعتبارات
عالم بے اعتبار پایا

مختاری کا مدعی جو ہے تو
بارے کیا اختیار پایا

ان آنکھوں کی کیا رسا نظر ہے
اس برچھی کو دل کے پار پایا

مرنا اس بن کہ جیتے رہنا
راسخؔ: کہو کیا قرار پایا

بھولوں انھیں کیا گمان ہے ناصح
جاتا ہے کوئی خیال ان کا

جن لوگوں کے تجھ سے دل لگے ہائے
جی ہے ان کا وبال ان کا

راسخؔ موے ہجر یار میں آہ
کہتے ہیں ہوا وصال ان کا

محو اس رُخ و زلف کا شب و روز
حیران آشفتہ سر رہے گا

تم بیکس ہو کے بعد میرے
برسوں مرا نوحہ گر رہے گا

دل دام میں اس کی زلف کے ہے
الجھا ہی یہ عمر بھر رہے گا

الفت سے ساز کر کا اس کو
آتا ہے دل گداز کرنا

ہنس ہم سے چھپا کے پوچھتے ہیں
کیا وجہ جو ہے یہ حال تیرا

تو کیا شے ہے کہ پاس ہے اور
ناممکن ہے وصال تیرا

راسخؔ تمہارے غم کو رکھے ہے بہت عزیز
مایہ ہے دو جہاں میں یہی اُس غریب کا

غم فرقت کے صدمے اب اٹھا سکتا نہیں راسخؔ
قریب مرگ دوری میں تری وہ ناتواں پہنچا

حلقۂ دام بلا ہے ہائے اس دل کے لئے
ان تری زلفوں کا اک اک بال بل کھایا ہوا

ایک کر دیوے ہے نیرنگ محبت دو کو — کچھ ہماری تو سمجھ میں نہ یہ نیرنگ آیا

عاشق اس پر ہوے راسخ جو نہ تھا چاہ کی گوں — دل لگانے کا بھی صاحب نہ تمہیں ڈھنگ آیا

حیا کے پردہ میں مارا ہے ایک عالم کو — شہید میں تو ہوں اس شرمگیں نگاہ کا

تھے ضبط ہی کے قابل اسرار محبت کے — جس نے کہا وہ شایان دار اور رسن کا تھا

پا برہنہ لاگ سے دل کی پھرے ہیں دشت دشت — کس قدر اس آبلے نے ہم کو سرگرداں کیا

بینا اُسی کی آنکھ تھی اہل نظر تھا وہی — جو اس چمن میں آن کر محو چمن آرا ہوا

راسخ یہ کیا اب تنگ ہے جینے کا کچھ بھی ڈھنگ ہے — کس گل کو چاہے ہے جو تو یوں سوکھ کر کانٹا ہوا

معنی کے تئیں ہم نے تو صورت ہی میں پایا — نقاش ہمیں نقش کے اندر نظر آیا

جوں تخم میں ہو صورت اشجار نہ ظاہر — تھا علم میں صانع کے نہاں اب جو بنایا

پنہاں رہی میرے تن لاغر میں تپ عشق — میں نے تو اس آتش کے تئیں خس میں چھپایا

ڈرتا ہوں ترا شکر میں ای دل کی اسیری — ہر چند برا الجھاؤ سے تو نے تو چھڑایا

کچھ گھٹتی چلی تھی کہ کھلے بالوں نے تیرے — پھر آہ پریشانیِ خاطر کو بڑھایا

پائے گا اس بے نشاں کا کچھ تو ای راسخ نشاں — آپ کو کھو کر جو بے نام و نشاں ہو جائیگا

خودی ہے تیری نقاب اس کے روئے زیبا کا — اٹھا دے اسکو اگر شوق ہے تماشا کا

کس طرح نہیں روغن سے یہ فروغ پذیر — چراغ عشق میں خوں چاہیے تمنا کا

تعجب کشتۂ عشق کا جگر تو دیکھ — کہ گل سمجھتے ہیں کانٹا بھی وہ کف پا کا

اس اپنے دیدۂ پر آب کے سوار راسخ — حباب کب کوئی رو کش ہوا ہے دریا کا

اس بزم میں جو مست تھا ہشیار وہی تھا — تھی بے خبری جس کو خبردار وہی تھا

آج آن کی نظر اور ہے کل تک تو یہ دستور — چتون وہی اخلاص وہی پیار وہی تھا

ٹھنڈی سانسیں یادِ رُخ میں اُسکی بھاتی ہیں مجھے　　چاندنی میں لطف ہے چلنا ہوائے سرد کا

مرا سینہ اے محبت جو بنے تو باغ کرنا　　یہ اسی لئے بنا ہے اسے داغ داغ کرنا
مجھے رفتگی سی کچھ ہے تری چشم دیکھ ساقی　　نہ شراب سے لبالب تو مرا ایاغ کرنا
دو جہاں میں تم کو بس ہے یہی داغ یار راسخ　　شب گور کا بھی اپنی تم اسے چراغ کرنا

دل قیمتی ہوا جو شکست آشنا ہوا　　یہ شیشہ ٹوٹنے سے جواہر بہا ہوا
بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل　　اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا
رکھتا ہوں دور آفتِ مرہم سے داغ کو　　اس واسطے کہ ہے یہ تمہارا دیا ہوا
کثرت سے حادثہ کی سر صفحۂ جہاں　　حرفِ غلط کی طرح ہوں میں ٹوٹا ہوا

پردہ ضرور کیا تھا جب سب تمہیں تھے صاحب　　حیرت یہ ہے کہ ہم کو کیوں درمیاں بنایا
قلب شکستہ ہی ہے عرش آفریں کا مسکن　　اس ٹوٹے گھر کو اس نے اپنا مکاں بنایا
حاصل ہے وہ ہنرمند اس ساری کارگہ کا　　جس نے کسی کے دل میں اپنا مکاں بنایا

اٹھ گیا پردہ سر ساماں طلب عریاں ہوا　　اے جنوں مجھ بے سر و پا پر ترا احساں ہوا
یہ دلِ بیتاب ضبط سوز عشق ایجو بسے　　قطرۂ سیماب میں آتش کدہ پنہاں ہوا
طالبِ افزونی حیرت ہیں اس کے روشنائی　　وجہ اس کی کچھ نہ سمجھا میں بہت حیراں ہوا

آئیں کیا کیا مشکلیں در پیش کارِ عشق میں　　کی مدد ناکامیوں نے تب یہ کام آساں ہوا

عقل والوں کے نہ آیا پیچ میں راسخ کبھی　　یہ بھی اس کی ذی شعوری تھی کہ سودائی رہا

مجھ سے کہنے لگے ہنس کر نمک افشانی کے وقت　　تو نے ہر زخم کو ناسور بنایا ہوتا

ق

عشق کرنا ہی نہ تھا کیا کیا تم نے راسخ　　صاحب! ان عاشق سے ہاتھ اٹھایا ہوتا

مرگ یکبارہ بھی مرنے سے ہر ساعت کے — جی دیا ہوتا دلے دل نہ لگایا ہوتا

نشانِ اشک خونیں سے ہے یہ رنگ — کہ اب صحن چمن دامن ہے اپنا
چراغ زرد ہے مہر اس کے آگے — دل ایسا داغ سے روشن ہے اپنا

ہم پہ انھیں مہربان کرے گا — یہ مہر کب آسمان کرے گا
مت پوچھ مجھ سے حال میرا — حیرت زدہ کیا بیان کرے گا
آتا ہے نظر کچھ اور رنگ آہ — کیا دیدۂ خوں فشاں کرے گا
تمکیں سے خموش اس کا رہنا — مجکو ہمہ تن فغان کرے گا

کہاں ہے تجکو بینائی وگرنہ — جہاں آئینہ ہے اس خودنما کا
نمایش نقش پا کی سی ہے میری — نشاں ہوں رفتگانِ تیز پا کا
کدورت کب ہے رستخ کو کسو سے — یہ شیوہ ہی نہیں اہلِ صفا کا

نازک ہے مزاج ناز تیرا — دل سے بھی کہوں نہ راز تیرا
اے دل نہ ہوا اس کا رکش ناز — کیا تو کیا بے نیاز تیرا
ٹپکے پڑتے ہیں آنسو رستخ — دل ہے کتنا گداز تیرا

دل تو محبت سے غم کا ہے دکھ پایا ہوا — ایک شیشہ یاں ہے سو بھی ٹھیس سا کھایا ہوا
جاؤ رستخ کی طرف صاحب کہ اب تم بن وہ آہ — دستِ بر دل ہر طرف پھرتا ہے گھبرایا ہوا

یہ ادا دیکھو مری خاک پہ برسوں کے بعد — شب جو آئے تو اٹھائے ہوئے دامن اپنا
جی میں ہے لاکے دکھا دیں کوئی بجھتا سا چراغ — اس پہ احوالِ زبوں کچھ تو ہو روشن اپنا

دیکھیے کیا ہو جدا ہوتے ہو اب تم اے آہ — دل جدائی سے تمہاری نہیں خوگر اپنا
کعبہ رہنے کی کہاں گو ہے بنا دیں گے ہم — کسو میخانے کی دیوار تلے گھر اپنا

نہ چاہا ایک برگِ گل بھی اس گلشن میں گلچیں سے ۔ بھرا لخت جگر سے ہم نے گوشہ اپنے داماں کا
کیا آزاد دامِ فکرِ عالم سے مجھے تو نے ۔ ہوں اے دل کی اسیری میں تو بندہ تیرے احساں کا
یہی ہے گر طپش دل کی تو آخر مار رکھے گی ۔ بغل میں پالنا اچھا نہیں اس دشمن جاں کا

مرتا ہوں آہ منہ پہ کئے ہو نقاب کیا ۔ اس واپسیں نگاہ سے میری حجاب کیا
حیرت کی وجہ پوچھو ہو منہ کو چھپا کے تم ۔ حیراں ہوں اس سوال کا دوں میں جواب کیا

نہ آتے وعدہ ہی کرتے تم کوئی پے رکھتیں ہ ۔ میں انتظار تو چندے بھلا کیا کرتا

آہ کیا وجہ ہے اس کی کہ شناسا تیرے ۔ ہرگز اقرار نہیں کرتے شناسائی کا

معشوق کا معشوق کیا عشق نے ہم کو ۔ اب صید ہمارا ہوا صیاد ہمارا
تاثیر کی آنکھوں سے ٹپک پڑتے تھے آنسو ۔ تھا جن دنوں دل مائل فریاد ہمارا
تا وصل رہی جانِ حزیں قیدِ جسد میں ۔ یارب تنِ خاکی نہ ہو برباد ہمارا

بنات سبز میں آب اور پتھر میں شرر پایا ۔ حقیقت ایک لیکن اس کو صد پیکر پایا
بہت حسن اس کا مشتاقِ نظر ہے کیسی مستوری ۔ دکھایا آپ کو اس نے جہاں جب صفا نظر پایا
کسی نسخہ کے ہوں اوراق سارے جس طرح برہم ۔ دل اک جا پایا بھی ہم نے سو پریشاں کس قدر پایا

امتحاں مخصوصِ خاصاں ہے تو راسخ شکر کر ۔ یار تیرے آزمانے کی طرف مائل ہوا

نہ پہونچا دست تاراجِ خزاں اس باغ تک ہرگز ۔ گلِ نو کی روش ہے تازہ ہر داغ کہن میرا

کرتے ہیں شکوہ آبلہ کا ہر قدم پہ ہم ۔ طے خاک ہم سے ہوگا بیابان عشق کا
کرتے ہو صرفہ جان کا راسخ زہے شعور ۔ پھر اس پہ نام لو ہو مری جان عشق کا

ناگفتنی ہے اپنا حالِ دلِ شکستہ ۔ نقشہ بیاں کروں کیا ٹوٹے ہوئے مکاں کا
ہر ایک رنگ سا کہ جب کہ دیتے ہیں تو در آوے ۔ آوے نظر تماشا تب تجکو گلستاں کا

دل آباد کو دشت آنکھوں کو دریا دیکھا — اک نظر دیکھ تجھے ہم نے بھی کیا کیا دیکھا
کچھ قراری نہیں آبادی و ویرانیِ دل — کبھو گلشن اسے دیکھا کبھو صحرا دیکھا
دعویِ دیں طلبی رکھتے تھے راسخ جو لوگ — خوب دیکھا تو انھیں طالب دنیا دیکھا

مت طریق دردمندی چھوڑ اے جویائے وصل — کہتے ہیں نزدیک ہے اس راہ سے گھر یار کا

پائی یہ سزا اس کی کہ روتا رہا بھر عمر — میں ایک الم کش کے تئیں دیکھ ہنسا تھا
ایسی ہی دوا پاؤں کی اپنے رہی بیڑی — کچھ اور نہ تھا بس یہی الجھاؤ پڑا تھا
راسخ کا ہر اک عضو لبِ مرگ تھا بے حس — دل کو حرکت تھی نہیں معلوم کہ کیا تھا

اگر کچھ درد رکھتا ہے تو راہِ عشق یوں طے کر — کہ نہ کانٹا کوئی ٹوٹے نہ پھوٹے آبلہ پا کا

اس سے پیدا ہے کہ ہشیار بہت تھا راسخ — وقت مرنے کے بھی وہ یار سے غافل نہ رہا

معرفت اس کی نہ واقع میں ہوئی صورت پذیر — یوں تو ہر عاقل اسے کچھ جی میں ٹھہراتا رہا
تہ میں ہر ہر رنگ کی تھا رنگ اس کا جلوہ گر — عشق کیا کیا رنگ اپنے ہم کو دکھلاتا رہا
صبح ہوتے ہی گیا راسخ گلی میں اس کی پھر — کل میں ساری رات اسے با آنکہ سمجھاتا رہا

مجھ دیوانہ بنا گلیوں میں پھروانا نہ تھا — پردہ کرنا تھا تو پہلے جلوہ دکھلانا نہ تھا
اختلافات صور کو پردۂ رو کیوں کیا — گر ظہور اپنا بطور مختلف بھاتا نہ تھا
تھا سزاوارِ دلِ محزوں تراہی داغِ عشق — قابل اس شیشے کے کوئی اور پیمانا نہ تھا
تھے ہزاروں دل جلے عاشق ترے اے رشکِ شمع — لیک میری طرح تجھ پہ کوئی پروانا نہ تھا
نیند آئے کیونکر اس کو سن کے میری سرگذشت — داستانِ دردِ دل تھی یہ تو افسانا نہ تھا
یہ پری خانہ جہاں کا صنعت اک ساحر کی ہے — حیف اس عاقل پہ جو یاں اس کا دیوانا نہ تھا
روئے خنداں کس کا یاد آیا تھا راسخ سچ کہو — بے سبب آنکھوں میں کل آنسو کا بھر لانا نہ تھا

جی تمہارا کہیں لگتا نہیں راسخ کیا ہے　　کہاں آنکھیں لگیں دل کس سے لگایا ایسا

عاقبت کھینچی پشیمانی ہی صورت گر نے　　نقشہ کھینچا نہ گیا میری پریشانی کا

سب علاقوں سے چھڑا دیتا ہے خاطر کا لگاؤ　　جس نے الجھایا کہیں دل کو بہت اچھا کیا

آہ زادِ آخرت کی فکر راسخ کچھ نہ کی　　کام اپنے بھی نہ آئے تم یہ تم نے کیا کیا

چشم جس دل کی وا ہوئی ای دوست　　جلوہ آیا اسے نظر تیرا

ہم ملیں منہ پہ خاک اور آئینہ　　دیکھے منہ آہ ہر سحر تیرا

راسخ اُس کی تو کنہ کب پاوے　　فہم و ادراک کس قدر تیرا

ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے　　گو زمانہ کو انقلاب رہا

وے رہے خواہاں مری خرابی کے　　میں اسی واسطے خراب رہا

آکے اس بحرِ حادثہ زا میں ہم　　کوئی دم میں بھی جوں حباب رہا

وارستہ ہم نے پائے اسیرانِ دامِ عشق　　دل جن کے بس رہے تھے انھیں کیا فراغ تھا

آگے ای بے مہر تھا عالم میں دستورِ وفا　　عہد میں تیرے ہی وہ دستور یاں سے اٹھ گیا

راسخ اس بزمِ جہاں میں شمع کے مانند ہوں　　ہو گا اک اندھیر میں جس دم یہاں سے اٹھ گیا

رفتہ سا میں اپنے ادراکِ حقیقت میں رہا　　کون ہوں کیا ہوں، نہ سمجھا بہ حیرت میں رہا

کب اقامت کی جگہ تھی کاروان گاہِ جہاں　　سخت غافل تھا جو یاں فکرِ اقامت میں رہا

آنکھ اپنی تو ای راسخ تھی حیرتی اُس رو کی　　کب محوِ تماشا میں گل اور سمن کا تھا

تمہیں جانو ہو خوب اسے یا یہی دل جو سلوک تمہاری جفا نے کیا

دلے اس کا گلہ نہیں تم سے مجھے جو کیا سو مری ہی وفا نے کیا

کبھو پرسوں نہ دیکھیں نہ پیار رکھیں کبھو دیکھتے یوں ہیں کہ مار رکھیں

زہے خوبوں کی خوبیِ ناز و ادا مجھے بے خود انہوں کی ادا نے کیا
غضب آہ رسا ہے نیچی نظر میرے سینے سے پار گذر ہی گئی
نہ کیا وہ سناں نے بھی معرکہ میں جو تمہارے حجاب و حیا نے کیا
خبر اپنی نہ صبح و شام ہے اب مجھے بے خبری ہی مدام ہے اب
کیا جادو نے اُن کی نگاہ کی جو نہ وہ بادۂ ہوش ربا نے کیا
ے حضرت راسخ اگر کہیں اب تو کہیں گے یہ اُن کی جناب میں ہم
کہو قبلہ و کعبہ وہ کیسا تھا گل نہیں کا تماشا جس کی ہوا نے کیا

ہو ضبط آب ٹوٹے ہوئے ظرف میں کہاں　　دل چاک ہو گیا ہے جو آنسو رواں ہے اب

عشق میں ہر زیاں ہی باعث نفع　　کس کو اندیشۂ ضرر ہے اب

غم کو راسخ کے تم نے طول دیا　　قصہ ہی اُن کا مختصر ہے اب

کیوں نہ جاری چشم سے ہو سیلِ اشک　　ابرِ غم دل پہ مرے چھایا ہے اب

راسخ اس عہد میں متاعِ وفا　　کیمیا کی طرح سے ہے نایاب

ہو نہ قیدِ عشق سے یا رب آزادی نصیب　　ہم ہوں یا غم دوست کا دشمن کو ہو شادی نصیب

پابند تعلق نہیں ہوتا دلِ عاشق　　آزاد ہے ہر شے سے گرفتار محبت

وے نہ آویں گے راسخ اب تم تک　　عمر رفتہ کا انتظار عبث

بود و باش جہانِ فانی ہیچ　　چار دن کی یہ زندگانی ہیچ

ہے بقا کس کو غیر ذات خدا　　حسرت عمر جاودانی ہیچ

صفِ عشاق میں اس شوخِ جفا جو کی نگاہ　　میرے ہی دل کے فقط پار ہوئی تیر کی طرح

کہاں کا دام فقط ہے تری نظر صیاد
جو چاہے صید ہوں ہم دیکھ ٹک ادھر صیاد

کہیں جاؤں کہ پرستۂ وفا ہوں میں
نہ باندھ خوف سے تو میرے بال و پر صیاد

فقط رنجوری ہم تو کھینچا کئے
غلط ہے کہ راحت ہو محنت کے بعد

راسخ اب ترک عشق کرتے ہیں
اس کے صدموں سے ڈر گئے شاید

پہونچے ہے باغ اس دل پر درد کو کہاں
یاں کی بہار اور ہے یہ گلستاں ہے اور

معزز ہو تو عشق میں خوار ہو کر
بن اکسیر خاک در یار ہو کر

گرانباری اچھی نہیں دیکھو راسخ
رہو اس سرا میں سبک بار ہو کر

روح کے قابض نے راسخ کو مبارکباد دی
خاتمہ جس دم ہوا ان کا تمہارے نام پر

اس پھول کو یوں رکھیو کہ مرجھا نہ اے دل
تجھ پاس یہ داغ اس کی امانت ہے خبردار

تا خواب مرگ کرتا اُن کا زبان پر
نیند آ گئی ہمیں تو اسی داستان پر

راسخ یہ کیا ہے عشق کو بدنام مت کرو
عاشق ہوا اور مرتے ہو نام و نشان پر

گذرے ہے پار سینے کے وہ سرمگیں نگاہ
یہ تیر نیم کش ہے وہی کارگر ہنوز

ضبط گریہ تو ہے پہ دل پہ جو اک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں بے وجہ ہنوز

آرام سے وہی ہیں دل آسودہ جو کہ ہیں
رکھتے ہیں ہائے ہم تو دل بیقرار پاس

لامکاں تک آہ رکھتی ہے رسائی کی ہوس
پہنچے ہے کیا دور اس تیر ہوائی کی ہوس

تم کو یہ شوقِ نمائش عیب معشوقی نہیں
لازمہ ہے حسن کے ہے خود نمائی کی ہوس

راسخ اے بے شرم اے بیدرد اے ننگِ وفا
ہے تجھے دل کی اسیری سے رہائی کی ہوس

یہ عہد وہ ہے کہ پوچھے ہے آہ ایک سے ایک
کہیں ہیں پیار کسے کیا ہے مہربانِ اخلاص

مانوس آہ ہے دل پہ داغ دیکھتے
بے طرح اس چراغ کو ہے اب ہوا سے ربط

سینہ تمام لالہ ستاں ہو رہا ہے ہائے — اس آسمان نے ہمیں کیا کیا دکھائے داغ

یا عہد ہے کہ سچے کو احمق کہے ہے خلق — دانا وہی ہے اب جو کہے سربسر دروغ

کے نغمہ پر دائے جی بکتے ہیں واں — کچھ عجب بازار ہے بازار عشق

راسخ ان کی آنکھ پڑتی ہے دو عالم پہ کہاں — عاشقوں کو اور ہی عالم دکھا دیتا ہے عشق

متصل روتے رہتے ہیں راسخ — پھر کسو پر ہوئے مگر عاشق

راسخ وہ سعی کر کہ یہ دل آئینہ بنے — کب تک بغل میں رکھے گا خانہ خراب سنگ

کفر و دیں کو ایک ہی سمجھو حقیقت میں کہ ہے — رشتۂ تسبیح زنار برہمن میں شریک

مجھے تو دنگی سی لگی میں اس کو کیا جانوں — تمہیں کہو کہ لیا تم نے کس ادا سے دل

مسافرانہ رہے ہم جہاں میں راسخ — لگایا ہم نے تو قصداً نہ اس سرا سے دل

آنکھ لگتی نہیں تری راسخ — پھر کہیں ان دنوں لگا ہے دل

کاش ہم کو خبر بے خبری بھی نہ رہے — نقص یہ ہے کہ ابھی اپنے خبردار ہیں ہم

عشق ہے حسن طلب حسن ہے مشتاق نظر — ہم کو درکار ہو اب تم تمہیں درکار ہیں ہم

ہمہ عصیاں ہیں پر اندیشہ نہیں کچھ زاہد — کہ کرم پیشہ ہے وہ جس کے گنہگار ہیں ہم

وہم کی سی ہے نمود اپنی جہاں میں راسخ — فی الحقیقت نہیں کچھ گرچہ نمودار ہیں ہم

راسخ ارادہ رکھتے ہو اس بت کے عشق کا — پتھر سے دل لگاتے ہو کیا بے جگر ہو تم

بیگانگی کا شکوہ نافہمی سے ہے اپنی — کب آشنا تھے جو اب ناآشنا ہوئے تم

شائستۂ جفا ہوا اس مرتبہ جو راسخ — ہے جرم یہ کہ صاحب اہل وفا ہوئے تم

اول ربط کا وہ پیار وہ اخلاص اُن کو — کبھو خوش پاتے ہیں تو یاد دلاتے ہیں ہم

مرے پاس کب وفا ہوئے ہو تم — کسو پر مبتلا ہوئے ہو تم ::

غدر خواہی کا اب دماغ نہیں ۔ خوش رہو گر خفا ہوئے ہو تم
خاک چھنوا کے ہاتھ آئے ہو ۔ نسخۂ کیمیا ہوئے ہو تم
آپ سے ہو گئے ہیں بیگانے ۔ جن سے ٹک آشنا ہوئے ہو تم
پھرتے ہو گھر گھر آئینہ کی مثال ۔ کس قدر خود نما ہوئے ہو تم

اس بزم جہاں میں رہے خاموش سدا ہم ۔ کچھ کہتے جو پاتے کوئی گوشِ شنوا ہم
بازار جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا ۔ لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنسِ وفا ہم

آنے میں سدا دیر لگاتے ہی رہے تم ۔ جاتے رہے ہم جان سے آتے ہی رہے تم
خوش آتی ہیں آنسو بھری آنکھیں مگر اسکی ۔ راسخ کو جو ہر آن رلاتے ہی رہے تم

کچھ چوٹ سی ہے دل پہ جو یوں رنجہ ہوئے راسخ ۔ صاحب تمہیں کس مرتبہ پاتے ہیں حزیں ہم

عموماً کاش محو جلوہ فرمائی نہ ہوتے تم ۔ جگہ دل میں مرے کرتے جو ہرجائی نہ ہوتے تم
تمہارا التفات خاص ہی وجہ جنوں ٹھہرا یاں ۔ تماشا ہم نہ بنتے گر تماشائی نہ ہوتے تم
نہ پہنچے حیف دل تک اے مقیمانِ درِ کعبہ ۔ جو یاں آتے تو واں محو جبیں سائی نہ ہوتے تم
یہ آرائش ہی روئے و گیسو کی لائی پیچ میں ہم کو ۔ نہ پھنستا دل اگر محو خود آرائی نہ ہوتے تم
دلیل فہم و دانش ہے یہی دیوانگی راسخ ۔ نہ عاقل ہم تمہیں کہتے جو سودائی نہ ہوتے تم

غفلت میں کٹی عمر نہ ہشیار ہوئے ہم ۔ سوتے ہی رہے آہ نہ بیدار ہوئے ہم
صیاد ہی سے پوچھو کہ ہم کو نہیں معلوم ۔ کیا جانئے کس طرح گرفتار ہوئے ہم

دربدر اس لئے مانند صبا ہوں میں کہ آہ ۔ نکہت گل کی روش پردے میں مستور رہو تم

اس کا ہر برگ آئینہ روئے چمن آرا کا ہے ۔ دیدنی ہے یہ چمن گر ہم نظر پیدا کریں
باوجود دل نظارہ کہ نہ تم حیرت ہے یہ ۔ آئینہ پاس اور ہم دیدار کو ترسا کریں

قید نام و ننگ ہے اے شیخ کو اب تک عشق میں	چاہتے ہیں درد محبت کے تئیں سودا کریں

طالبان یار کی منزل تو غیر از دل نہیں	کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

نقش پا سے ہیں تمہاری رہ میں لیٹنے دو ہمیں	خاکساروں کے مٹا دینے سے کچھ حاصل نہیں

عقل والوں ہی کو ہے حلقہ سے اس کے رستگی	اس کا دیوانہ نہ ہوا ایسا کوئی عاقل نہیں

کفر ہے علم وجود غیر پیش حق شناس	یہ نہ ہووے شیخ تو پھر کفر بھی باطل نہیں

مت خیال اپنے آپ کو دل میں اغیر دے جگہ	یہ تو خلوت خانۂ معشوق ہے محفل نہیں

نصیب بندہ ہووے کاش ایسی خود فراموشی	تمہاری یاد میں اپنے تئیں صاحب بھلاؤں میں

خواب دشمن ہے مرا افسانۂ حیرت فزا	جس نے یہ قصہ سنا نیند اس کو پھر آئی نہیں

قالب خاکی میں گویا کون ہے حیران ہوں	وائے وہ اس کا جسے شوق شناسائی نہیں

پیوند رگ جاں سے مری جس کو نہ ہوئے	ایسا نہیں ہو کوئی تری زلف سیہ میں

دل خانۂ صنعت معمار تمنا ہے	کیا کیا رکھی ہیں وسعتیں تھوڑی سی جگہ میں

ڈوبتوں کی سی نمائش ہے نمائش اپنی آہ	کوئی دم پیش نظر ہیں دیکھیو پھر ہم کہاں

عالم اے شیخ عجب اک صفحۂ تصویر ہے	سیر کر لے اس کی تو پھر پائے یہ عالم کہاں

خموشی کے پردے میں ہے شور میرا	مجھے چپ نہ جانو سراپا فغاں ہوں

مجھے اس کی شرمائی آنکھوں نے مارا	حیا کشتۂ یار نامہرباں ہوں

جز داغ ہے کیا دل حزیں میں	لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

دل کیوں نہ عزیز مجکو ہووے	ہے نام تمہارا اس نگیں میں

پر خوف تر ہے کیا ہی صحرائے محبت کی	ہر گام پہ سر ہم نے اس راہ میں پائے ہیں

ہنر مستغنی اس سے ہے کہ قدر افزا میسر ہو	شناسا گو نہ ہو تیرا کوئی پہ تو تو گوہر ہو

یہ قلب آب گشتہ ہی قبولِ عکس کے قابل — مقابل ہو اس آئینہ سے گر تم کو نہ باور ہو

کہیں کیا تجھ سے ہم ناصح ٹپکتے ہیں کیوں آنسو — وہ سمجھے جو اس کی کچھ بھی جس کے چوٹ دل پر ہو

پوچھو مت عشق کے ذوقِ غمِ پنہانی کو — کیجیے کس طرح بیاں لذتِ روحانی کو

گذری کس لطف سے بے منت مخلوق اپنی — ہم نے سرمایہ کیا بے سر و سامانی کو

دیکھ کر زخم جگر میرا سراہے ہیں لوگ — میں سراہوں ہوں تمہاری نمک افشانی کو

کاش یہ زلفِ دراز اپنی نہ کھولی ہوتی — تم نے کیوں طول دیا میری پریشانی کو

ساجدانِ درِ جاناں کی ہے تقلید بھی خوب — راسخ آلودہ رکھو گرد سے پیشانی کو

دل سے میرے کیا تکلف اے غم و درد و اضطراب — یہ تمہارا گھر ہے یاں جب جی چاہو آیا کرو

جانیو سہل نہ اس رونے رلانے کے تئیں — قلب پانی ہوا تب یہ ہنر آیا ہم کو

راسخ خودی کو دخل نہیں بزم یار میں — یوں جاؤ واں کہ اپنے تئیں بھی خبر نہ ہو

آرائشِ زلف اپنی کیا ہم کو دکھاتے ہو — کیوں ہائے دوانے کی زنجیر ہلاتے ہو

ترجیح دو ان لمبے بالوں پہ نہ سنبل کو — خاموش رہو یارو کیوں بات بڑھاتے ہو

اشیائے دو عالم پر آنکھ ان کی نہیں پڑتی — کیا دیکھنے والوں کو تم اپنے دکھاتے ہو

مشتاقوں کے جینے کی صورت ہی نہیں کوئی — آنکھیں تو چھپائیں تھیں اب منہ بھی چھپاتے ہو

محرم جسے کرتے ہو اسرار کا اپنے تم — حیراں ہوں کہ دیوانہ کیوں اس کو بناتے ہو

کیا چاہنے والوں کی مٹی ہے خراب آخر — مر جاویں تو تربت بھی تم ان کی مٹاتے ہو

ہوتے ہو نگاہ افگن غیروں پہ مرے ہوتے — بھولے ہو نشاں کیسا تم تیر لگاتے ہو

ق

ہم سے نہیں ہو سکتے ضبط آنسو تو اے راسخ — جب قصۂ درد اپنا رو رو کے سناتے ہو

ہر حرف جگر پارہ الماس فشاں گویا | تم آپ بھی روتے ہو ہم کو بھی رلاتے ہو

نہ چشم کم سے دیکھو اے ابر اشک چشم کو میرے | یہ قطرہ قابلیت اس کی رکھتا ہے کہ دریا ہو
کوئی بانی ہے بے شک محفل زیبائے عالم کا | نہ ہو یوں منتظم مجلس نہ جب تک مجلس آرا ہو
تجلی دوست ہے تو سعی کر تا دل ہو ویراں تر | کہ وسعت پرتو مہ کی بقدر طول صحرا ہو
فقط ہے ظلمت تن ہی صفائے روح کی مانع | یہ گرد اڑ جائے تو کیا آب اس گوہر میں پیدا ہو
اگر ہے شور کچھ سر میں تو رکھ کوئے جنوں میں پا | قبا کر جیب منہ پر خاک مل بدنام و رسوا ہو
محبت کا تصرف یوں ہے میرے قلب محزوں پر | کہ زخمی عضو میں جس طرح نشتر درد افزا ہو

اس دام تعلق سے رہا ہونے کی ناسخ | تدبیر یہی ہے کہ کہیں دل کو پھنساؤ

سبب کیا ہے جو کچھ کھوئے گئے سے پا جاتے ہو | سر حرف و حکایت وا کرو تنگ کیوں چھپاتے ہو
تحیر ہے مجھے اس کا کہ کیوں حیران ہو ایسے | تمہیں اک زندگی سی ہے نظر بیخود سے آتے ہو
بہت کچھ صورت احوال بگڑی سی تمہاری ہے | نہ آئینہ کبھو دیکھو ہو نے زلفیں بناتے ہو
توجہ حال پر میرے کبھو آگے نہ تھی ایسی | جو در اب دیکھتے ہو یا اشارے سے بلاتے ہو
بہت سا فرق ہے بے اعتنائی بے نیازی میں | کسو کے ناز کے کیا ان دنوں تم ناز اٹھاتے ہو
علاقہ ہو کہیں دل کا تو ناسخ سے کہو صاحب | وہ نامحرم نہیں کیوں اس سے یوں شرما جاتے ہو

کیا ہو دل ناشاد کو گر شاد کرے تو | کیا ہو جو یہ ویرانہ پھر آباد کرے تو
میں رویا تو ہنس کر یہی بولے دم رخصت | بھولوں تجھے ایسا کہ بہت یاد کرے تو
جینے کا یہ باعث ہے کہ ہیں قید میں تیری | مر جائیں ابھی گر ہمیں آزاد کرے تو
آوے چمن آرا ابھی نظر گر بہ تامل | سیر چمن عالم ایجاد کرے تو
گردوں کا طالب ہے تو بے درد بھی ناسخ | لازم ہے کہ نالاں رہے فریاد کرے تو

تاریک اس قدر تو نہیں گور کی بھی رات | نسبت دوں کس سے ہجر کے روز سیاہ کو

سلگاتے ہو رہ رہ کے عبث دل کی نہیں آہ | اس گھر کو جلانا ہے تو اک بار جلا دو

نہ کرو مرزائی خاک کوئے رسوائی ہو | عشق میں راسخ جو عاقل ہو تو سودائی ہو

شرط الفت ہے یہی رکھو اُسی کی دل میں چاہ | گو وہ ہرجائی ہے لیکن تم نہ ہرجائی ہو

دوست سے گر چاہتے ہو راہ پیدا ہو تمہیں | دشمنوں کے جاؤ منت کش ہو مجرائی ہو

وسعت شہر تھی اک گوشۂ زنداں مجھکو | لے گئی وحشت دل سوئے بیاباں مجھکو

پیش ازیں وے جو مرے رنج پہ چشمک زن تھے | آنسو بھر لاتے ہیں اب دیکھ کے گریاں مجھکو

کب سرد کرے آتش دل آہ حزیں ہو | ڈرتا ہوں ہوا وجہ ترقی نہ کہیں ہو

مستِ مئے پندار ہیں سب اہل مساجد | گر ہوش تجھے ہے تو خرابات نشیں ہو

ذردیدہ نگاہوں کے ہے انداز سے پیدا | دل جس نے چرایا ہے ہمارا وہ تمہیں ہو

راسخ ہمہ تن ذوق ہیں وے جنکے پھنسے دل | لذت سے اسیری کی تم آگاہ نہیں ہو

تصور بھی تمہارا منہ چھپا کے دل میں آتا ہے | تم ایسے آپ کو بے وجہ کیوں ہم سے چھپاتے ہو

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آوے | گلہ بھی یار کا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

ان کو بھی یاد سے جانا تھا ہماری سو ہائے | آپ تو جی میں رہے اور بھلایا ہم کو

یہ دل کہ سنگ تیرہ کو اس پہ شرف ہے اب | گر صاف ہو تو آئینہ روئے یار ہو

کیوں بڑھاتے ہو تم اسباب خود آرائی کو | طول مت دو مری بدنامی و رسوائی کو

مانع دید ہے افراطِ تجلی اُن کی | وے نظر آویں اگر تاب ہو بینائی کو

کھینچی رہتی ہے زلفِ یار ہی دل سے ہمارے کچھ | وگرنہ ربط رہتا ہے پریشانی پریشاں کو

شرکت سحر ہے طرز نگہہ یار کے ساتھ | مار رکھا اُسے دیکھا جسے ٹک پیار کے ساتھ

ہی سبب طولِ امل کا یہی اک تارِ نفس — سارے الجھاؤ ہیں وابستہ اسی تار کے ساتھ
کس قدر بو قلموں جلوہ ہی اپنا محبوب — کوئی بھی اس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ

دلِ تنگ اپنا وسعت کتنی رکھتا ہی یہ کیا جانوں — پر اتنا جانتا ہوں میں کہ تو اس میں سمایا ہی
پڑی ہی چشمِ سوزن بھی نہ زخمِ تیغ پر اس کے — اسے نامحرموں کی آنکھ سے ہم نے چھپایا ہی
مبارک ہو تمہیں چاہت بہت ارمان تھا اس کا — سنا ہی ہم نے راسخ جی کہیں تم نے لگایا ہی

طرزِ نگہ تمہاری جو سحر کار گر ہی — ٹک اس طرف تو دیکھو صاحب یہ کیا نظر ہی

ق

دیر و حرم کہاں کا عرشِ بریں ہی کیسا — مطلوب کس طرف ہی غفلت سے تو کدھر ہی
جویا اگر ہی ان کا جاتا دلِ شکستہ — دے ہیں اسی میں یہ جو ٹوٹا ہوا سا گھر ہی

جوگی ہی کوئی ان میں کوئی ہی روگی ان میں — دیکھے ہیں لاگ والے ہم نے تمہارے در کے

اپنے گلے بندھی ہی تعظیمِ تیغِ قاتل — جب ذکر اس کا آیا تب سر جھکا دیا ہی

بے لذت و بے ذوق و بد دماغی نہ ہو جب تک — اس باغ میں دل کا بھی ثمر طرفہ ثمر ہے
نقاش کی خوبی کو نہیں دیکھتے راسخ — اس نقش ہی کے محو ہو تم دھیان کدھر ہی

کس کے چہرے کا حیرتی ہی ماہ — جملہ تن ایک دیدۂ وا ہی
ہم غبار آئینہ سے کیا رکھیں — درمیاں ان کا روئے زیبا ہی
کچھ نہ سمجھے گئے کسو سے تم — بارے اتنا تو ہم نے سمجھا ہے
دل سے غافل ہوں یک جانوں ہوں — کہ اسی گھر میں کچھ تماشا ہے
دے گئے تم نہ مر گئے راسخ — جیتے ہو اب تک آہ یہ کیا ہے

حالِ دلِ شکستہ تم بن یہ ہی کہ جیسے — ہیئت بگڑ گئی ہو ٹوٹے ہوئے مکاں کی

باہر بیان سے ہے یہ اضطراب بے حد
ٹھہرے تو کچھ بیاں ہو حالت دل طپاں کی

دل کو نہ کہو کہ غنچہ سا ہے
غنچہ نہیں باغ دل کشا ہے

اک ان کی نگاہ آشنا نے
سب سے بیگانہ کر دیا ہے

بینائی ہمیں نہیں وگرنہ
وہ جلوہ فروش خود نما ہے

تم جی میں ہو اور کچھ نہیں یاں
پوچھو ہو کہ جی میں تیرے کیا ہے

آہ مر کر بھی فراغ اس سے بہ دشواری ہے
دل کا الجھاؤ بھی اک سخت گرفتاری ہے

بھلا کہو کہیں ایسے میں اپنا کیونکر حال
کہ جب وہ سامنے ہو طاقتِ بیاں نہ رہے

نمود کو نہیں راسخ طریق عشق میں دخل
مٹاؤ اپنے تئیں یوں کہ کچھ نشاں نہ رہے

ہائے یوں دیکھا کہ میرا کام ہی آخر ہوا
لگ گیا زخم اس نگہ کے تیر کا کاری مجھے

آہ اب اس مہلت کم کو جسے کہتے ہیں عمر
کاٹنا تم بن پڑا ہی کیا ہے دشواری مجھے

شایان آشنائی کوئی نہیں جز اس کے
بیگانگی ہی اپنی اب ایک آشنا ہے

ہر سایۂ مژہ میں واں وہ نگاہ بانکی
یاں پار ہے جگر کے کیا جانئے کہ کیا ہے

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے
دشت یاں شہر ہوئے شہر بیابان ہوئے

شوق چاہے ہے کہ بے پردہ رخِ یار رہے
گو نہ موسیٰ کی طرح طاقتِ دیدار رہے

صرف خندۂ بیجا ہوئی اوقاتِ عزیز
اب ہمیں رونے سے کیونکر نہ سروکار رہے

گنہ اک جنس ہے رد کردۂ بازارِ قبول
کرم ان کا ہے کہ وے اس کے خریدار رہے

ہے اسیران محبت کی رہائی دشوار
ہائے یہ لوگ تو مر کر بھی گرفتار رہے

عشق اک حاکم جابر ہے اگر حکم کرے
دیر میں شیخ حرم باندھ کے زنار رہے

منعکس اس سے ہے آئینۂ عالم سارا
وے اسی آئینہ میں آکے نمودار ہوئے

شکر ہم موردِ جورِ ستمِ یار ہوئے — امتحاں کے تو بھلا اس کے سزاوار ہوئے
محو کیا نقشِ محبت ہو کہ اربابِ وفا — جتنے مٹتے گئے اتنے ہی نمودار ہوئے

نہیں شائستۂ دردِ محبت قلبِ بے درداں — اُسے یہ درد دیتے ہیں جو ہیں ہمدرد درماں سے

جز درِ کعبۂ دل سر نہ جھکایا ہم نے — بابِ سجدہ اسی دروازے کو پایا ہم نے
سیمیا سازیِ اوہام سراسر ہے یہاں — اعتبارات سے دل کو نہ لگایا ہم نے
دل کا جو زخم ہے صندوقِ پُر از نشتر ہے — کس قدر درد کا ساماں بڑھایا ہم نے
اپنے اسرار کا ہمسا نہ امیں پاؤ گے — جو کہا تم نے وہ دل سے بھی چھپایا ہم نے
خواہشیں جمع تھیں دل میں سو کیا ان کو وداع — کوچ سے آگے ہی اسباب لٹایا ہم نے

اس روش تا یہ نشاں بے نشاں کا پا دیں ہم — پہلے یہ نام و نشاں اپنا مٹایا چاہیے
شوق چاہے ہے بنے افسانہ رازِ عاشقی — حکمِ غیرت ہے کہ دل سے بھی چھپایا چاہیے

مشکل گزار اے بوالہوس ہے یہ طریقِ عاشقی — جاتے ہیں سر یاں ہر قدم پا لغزہ میداں ہے
ناآشنائے معرفت تنہا نہیں ہیں حیرتی — اس کا شناسا جو ہوا وہ اور بھی حیران ہے
ہے اس میں فوتِ مدعا وجہِ حصولِ مدعا — یہ کارِ عشق و عاشقی مت جانیو آسان ہے

اس کام جانِ دل کو پا دیا سو کس روش ہم — نام اس کے ہیں ہزاروں پہ ہائے بے نشاں ہے
تم بن ہے کیا بنائے ہستی میں یاں تزلزل — ہر آن مضطرب دل، ہر دم جگر طپاں ہے

کچھ کمی سوزشِ دل میں تھی سو گریے سے بڑھی — آگ بجھتی ہوئی اس پانی نے سلگائی ہے
اپنی رسوائی کے آئینہ میں دیکھوں ہوں تجھے — کہ عیاں اس میں تری خوبی و زیبائی ہے

پایانِ کار دیکھئے پاوے ہے کیا قرار — اچھے نہیں ہیں ڈھنگ دلِ بیقرار کے
پیری میں وہ نشاطِ جوانی کہاں ہے اب — آئی خزاں کی فصل گئے دن بہار کے

اٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم — ہوئے ہیں ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے
ہوئے مغلوبِ شوقِ کار فرما آخر آخر ہم — ہمیں تھا اختیار آگے پر اب بے اختیاری ہے
نمود وہم ہے بے شک سراسر عالم وہمی — دل اس سے مت لگا یہ کارخانہ اعتباری ہے

گل ہائے باغ جاناں لے جاؤ ساتھ راسخ — تا گور بھی تمہاری باغ و بہار ہووے

پابند بہار اپنی کب آشفتہ سری ہے — یاں فصل خزاں میں بھی سدا جیب دری ہے
قرب ابرو کا اس چشم سے میں دیکھ کے ڈرتا ہوں — پاس ایسے سیہ مست کے تلوار دھری ہے
ہشیار کہاں محرم اسرار ہیں اس کے — رکھتے ہیں خبر وہ ہی جنھیں بے خبری ہے

حقیقت دیدہ و دل کی مرے پوچھے جو تو قاصد — تو رو رو کر یہ کہیو ایک صحرا ایک نادی ہے
جسے دیکھو ہو اس کو آپ سے بیگانہ کرتے ہو — یہ کیا آنکھیں ہیں کس سے یہ نگاہ آشنا دی ہے
رہا کرتے ہیں محو روئے خوب لبراں راسخ — ان آئینوں نے ان کی کچھ عجب صورت نکالی ہے

سوزندہ جو تھا طور کا وہ نور جلالی — اب دل میں ہمارے ہے تجلی جمالی

تربیت وجہ ترقی ہے جو ہو استعداد — قابلیت ہو تو پھر قطرہ بھی دریا ہووے

ہوئے ہیں پیر ہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے — پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے
فلک ایسا ہمارے درپئے ایذا نہ تھا آگے — یہ بے مہری تمہاری ہے تمہارا ہی اشارہ ہے

نہ اربابِ وفا پر مائلِ جور و جفا ہوتے — جو دل پھنستا کہیں تو تم بھی پابند وفا ہوتے
نمک پاشِ دلِ مجروح بے دردی کے باعث تھا — مزہ تب تھا کہ وے کچھ درد سے بھی آشنا ہوتے
اگر بابِ اجابت تک رسا ہوتی دعا اپنی — تو جی میں تھا کہ خواہانِ دلِ بے مدعا ہوتے
پھنسے ہو بے طرح دامِ محبت میں تم اے راسخ — اسیر اس کے تو مر کر بھی نہیں ہرگز رہا ہوتے

نگراں کبھو نہ یہ جانب رخ دل فریب پری رہی

مری چشم تا نگہہ پسیں تری محو جلوہ گری رہی
نہیں مہوشں والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو انھوں پہ ہے
جنھیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی
مجھے سونپ داغِ فراق وے ہوئے یوں جدا کہ نہ پھر ملے
مرے دل میں تا دمِ واپسیں وہ امانت ان کی دھری رہی

گل و لالۂ چمن جہاں ہوئے شگفتہ دامنِ دل کشاں
لگی آنکھ داغوں سے سینے کے یہی پھول ہم کو تو بھا گئے

ہو آگ جیسے قافلۂ رفتہ کا نشاں — یوں دل میں میرے داغِ غمِ رفتگاں رہے
بے مہری فلک کا سبب ہے یہی کہ تم — صاحب ہمیشہ بندے پہ نامہرباں رہے
پایا نشان یار کے گھر کا نہ ہم نے سہل — اس جستجو میں مدتوں بے خانماں رہے
اس کارواں سرا میں تو ہر کوچ ہی کا شور — عبرت کا یہ مقام ہے کیا کوئی یاں رہے
کیا جوش دل میں تھی کہ مرے پر بھی دیر تک — راسخ کی آہ آنکھوں سے آنسو رواں رہے

اس شوخ کی نگہ سے جگر سب فگار ہے — واں تیرِ نیم کش ہے یہ یاں دل کے پار ہے
اس راہِ عاشقی میں کہ مشکل گذار ہے — جو سر بکف ہے اس کا قدم استوار ہے
لے جا تو آن کر مجھے پیش از ودائع یار — اے بے خودی پہنچ کہ ترا انتظار ہے
وے دن گئے کہ ضبطِ بکا پر تھا اختیار — اب ہم ہیں اور گریۂ بے اختیار ہے
راسخ تو آہ مرثیہ گو اپنے دل کے ہیں — رونا رلانا بس یہی ان کا شعار ہے

کچھ قراری نہیں آبادیِ معمورۂ دہر — جس جگہ شہر تھے واں ہم نے بیاباں پائے
منزل اس راہ سے نزدیک بہت ہے لیکن — کم شناسائے رہِ چاکِ گریباں پائے

کسو کے سلجھے بالوں سے رہے الجھاؤ خاطر کو کہ آزادی کا باعث بس یہی دل کی اسیری ہے

نہ رسم مہر سے واقف نہ آئین وفا جانے بتا اے بے مروت رہنے والا تو کہاں کا ہے

نظر تک بھی جا و تھم کہ دم آنکھوں میں ہے میرا نگاہ واپسیں دیدار کو کیا کیا ترستی ہے

لازم ہے جستجو میں سدا اس کی تو رہے گو وہ ملے نہ تجھ سے تجھے جستجو رہے

اے کاش مجھ سوا نہ کسو سے ہوا اس کو لاگ دشمن مرے ہی جی کی تری آرزو رہے

خشکی دامن مزہ ذلت ہے عشق میں راسخ تم اس کو تر رکھو تا آبرو رہے

بڑی آفت ہے جو بیگانگی ہے اس سے بہتر تھی نہ ہوتی آشنائی کاش ہم کو آشنائی سے

عشق میں ہے آبرو اس دیدہ تر سے مجھے ہر عزیز آنسو کا اک اک قطرہ گوہر سے مجھے

تیرے بالوں کا ترے سودا درازی کو کھچا سر برہنہ لے گیا بازار سے گھر تک مجھے

دل کسو کے ساتھ راسخ پھر لگا بیٹھے ہو کیا آج آتے ہو نظر کچھ سمت مضطر سے مجھے

اک پری چہرہ نے دیوانہ بنایا ہے مجھے کچھ عجب ہوش ربا جلوہ دکھایا ہے مجھے

سر بازار جو داپ سے آیا نہیں میں جلوہ دکھلانے کو اپنا کوئی لایا ہے مجھے

شکر صد شکر کہ بازیچہ معشوق ہوا گہہ بگاڑا ہے مجھے گاہ بنایا ہے مجھے

تیرا یہ ماندہ وصل یار اس میں کیا قصور ہاتھ بخت نارسا کا اپنے ہی کوتاہ ہے

ہوش والے محرم راز اس سکا اے راسخ نہیں کہتے ہیں جو بے خبر ہے کچھ وہی آگاہ ہے

زمن ہے عشق کے ناموس کا پاس اے راسخ شمع کو نہ کہیو تم پوچھ کے پروانے سے

جو بندہ کہ رحمت کا سزاوار نہیں ہے اس کا یہ گنہ ہے کہ گنہگار نہیں ہے

مت ہم کو ڈرا اس سے گذر جائیگا زاہد دن حشر کا فرقت کی شب تار نہیں ہے

کس طرح یقین آوے مجھے آنے کا تیرے اک بار اگر ہاں ہے تو سو بار نہیں ہے

ہوں شعلۂ تصویر دو چراغِ شبِ مہتاب — جلنے کی مرے کوئی خبردار نہیں ہے

اے شیخِ حرم خرقۂ پندار میں تیرے — وہ کون سا ہے تار کہ زنّار نہیں ہے

تھی دید کی رخصت تو نہ تھی طاقتِ دیدار — طاقت ہے تو اب رخصتِ دیدار نہیں ہے

ہیں پست و بلند اس میں بہت دیکھیو اے شیخ — وہ عشق کے ویرانے کی ہموار نہیں ہے

آنکھوں میں نور آ گیا یوں دیکھ اسکا نور — روشن چراغ جیسے کہ ہوئے چراغ سے

صبح سے بے تابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ سجھاتا ہے — دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

مقیم کعبہ کب ہوں جانیوالے کعبۂ دل کے — اقامت راہ میں کرتے نہیں مشتاق منزل کے

پری کا جلوہ دے سکتا نہیں ہرگز فریب ان کو — بہت عاقل ہیں دیوانے تری شکل و شمائل کے

کروں کیا شرح محرومی کی اپنی آہ میں وہ ہوں — کہ ڈوبی ہے مری کشتی پہنچ کر پاس ساحل کے

گم نام ہو کے آپ کو جو پاہے گر اس کا — ستیدۂ معشوق ہی نام و نشاں ہے

نگاہِ آشنا وہ کیا تھی یہ بیگانگی کیا ہے — ادھر تو دیکھ لے ای آشنا ناآشنائی کے

دل نے تو اٹھائے شعلے جاں سے — چنگاری یہ آ پڑی کہاں سے

اس فرقِ نیاز کو ہمارے — ہے لاگ سی اس کے آستاں سے

اے بے خودی تو اٹھا دے آ کر — پردہ یہ خودی کا درمیاں سے

اٹھا دیں کس روش اس باغِ دل کش سے دل اپنا ہم
کہ ہر کانٹے سے یاں الجھا ہوا اپنا تو داماں ہے

ذکیا شعر ہے کہ حیرت ہے دلیلِ معرفت تیری
جسے کچھ بھی شناسائی ہوئی تجھ سے وہ حیراں ہے

رُباعی

غم تیرا کسو کو کب سناتا ہوں میں ٭ اس راز کو کب زباں پہ لاتا ہوں میں
کہنے نہیں دیتی مجھے یہ غیرت عشق ٭ دل سے بھی تیرا درد چھپاتا ہوں میں

دیگر

دیکھی فقط آرائشِ دنیا تم نے ٭ پیدا نہ کیا دیدۂ بینا تم نے
مصروف تماشائے چمن ہی رہے آہ! ٭ داؔسخ چمن آرا کو نہ دیکھا تم نے

تمت بالخیر

حاشیہ متعلق صـــ۲۴۔ راؔسخ کے تلمذ کے سلسلے میں قیاساً میں نے لکھ دیا تھا کہ غالباً فارسی کلام پر حضرت تپاںؔ (پھلواروی) سے اصلاح لی ہوگی لیکن اِس صفحہ کے چھپ جانے کے بعد میری نگاہ سے ایک کتاب گذری جس سے میرے قیاس کی تصدیق ہوگئی۔ لہذا اصل کتاب کی عبارت درج کی جاتی ہے اور آیندہ بھی جو مزید تحقیق راؔسخ مرحوم کے متعلق ہوگی، انشاءاللہ آیندہ اشاعت میں پیش کروں گا۔ میں علمی تحقیقات میں کبھی بھی پہلوتہی سے کام نہیں لیتا اور نہ میرا یہ خیال ہے کہ میں نے جو لکھا ہے وہ قطعاً صحیح ہے۔ میری تحقیقات اور معلومات کو جہاں تک دخل تھا، میں نے اُن میں کوتاہ دستی یا کوتاہ نظری سے کام نہیں لیا ہے۔ خاتم سلیمانی مصنفہٗ شاہ غلام حسنین صاحب پھلواروی۔ حصہ چہارم صـــ۱۵۸ ملفوظات۔ (۲۲۰) ..... "ہمارے ہاں بھی راؔسخ مرحوم کی تحریریں موجود ہیں، وہ اپنا فارسی کلام تو پھلواری ہی کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت تپاں قدس سرہٗ کو دکھاتے تھے"۔ حمید غفرلہٗ

مطبوعہ
اسلامی پریس، گورہٹہ، پٹنہ سیٹی